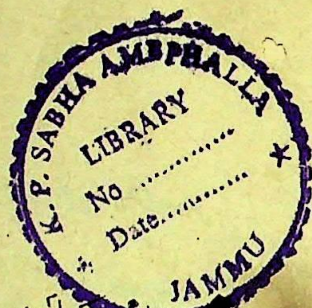


ماہنامہ

شیرازہ

سری نگر

جلد ۲۰ * اکتوبر ۱۹۸۱ * شمارہ ۱۰

نگران و مدیر اعلیٰ

محمد یوسف ٹینگ

ایڈیٹر

محمد احسن اندرابی

جموں اینڈ کشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لینگویجز سرینگر

ناشر :- سیکریٹری جموں اینڈ کشمیر اکیڈیمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز

مطبع :- جہانگیر پریس، سرینگر

کتابت :- محمد صدیق - جی حسن - شریف احمد
شوکت احمد - حلیفہ بانو

شرح چندہ :- سالانہ ——— ۲۰ روپیے
فی پرچہ ——— ۲ روپیے

* خط و کتابت کا پتہ *

ایڈیٹر "شیرازہ" (اردو)

جموں اینڈ کشمیر اکیڈیمی آف آرٹ، کلچر اینڈ لینگویجز

لال منڈی، سرینگر۔

سرورق

غ - شیخ محمد حسن

ترتیب



حرفِ آغاز

اکتوبر ۸۱ء کا شمارہ پیشِ خدمت ہے۔ اس شمارے میں دوسرے مضامین کے علاوہ شیخ محسن فانی کے بارے میں ڈاکٹر اکبر حیدری کا ایک تحقیقی مضمون بھی شامل کیا گیا ہے۔ جس میں حیدری صاحب نے کچھ نئی باتوں کا انکشاف کیا ہے۔

اکتوبر میں اردو کی ممتاز افسانہ نگار محترمہ عصمت چغتائی سرینگر تشریف لائی تھیں۔ اکیڈمی نے ۷ر اکتوبر کو ان کے اعزاز میں ایک عصرانے کا اہتمام کیا جس میں وادی کے اردو اور کشمیری زبانوں کے ادیبوں اور شاعروں نے شرکت کی۔ اکیڈمی کے سیکریٹری جناب محمد یوسف ٹینگ نے عصمت آپا کا استقبال کیا۔ اور حاضرینِ محفل کا ان سے تعارف کروایا۔ رسمی گفتگو کے بعد عصمت آپا نے اردو افسانے کے بارے میں اپنی آراء سے حاضرین کو مستفید کیا اور اردو زبان و ادب کے بارے میں ان کے سوالات کا جواب دیا۔

ایڈیٹر

(ڈاکٹر) اکبر حیدری کاشمیری

شیخ محسن فانی

شیخ محمد محسن نام اور فانی تخلص، شیخ محمد حسن ابن شیخ محمد کے بیٹے تھے (واقعات کشمیر صفحہ ۱۷۱ اعظم دیدہ مری ۲م) فانی کے حالات زندگی بہت کم دستیاب ہیں۔ وہ اپنے زمانے میں ایک مسلم الثبوت استاد، اعلیٰ پایہ کے مفکر، عظیم فلسفی، جید فاضل اور سربرآوردہ فارسی شاعر تھے۔ مشہور اور مستند فارسی شاعر ملا محمد طاہر غنی کشمیری (ف ۱۰۷۹ھ) نے فانی کی خدمت میں ہی زانوئے تلمذ تہہ کیا تھا (تذکرہ نصرآبادی قلمی) اور ان کی شاگردی فانی جیسے استاد کی دستار فضیلت کا طرہ امتیاز تھا۔ مسلم شاگرد غنی کشمیری دیباچہ دیوان غنی میں فانی کے علمی تبحر اور عظیم المرتبت شخصیت کا اعتراف ان الفاظ میں کرتے ہیں:-

"غنی دریں کمالات کتب فواضل مآب عارف معارف حقانی، سالک مسالک سبحانی حضرت شیخ محسن فانی دامت علی سائر المسلمین فیوضانہ انتساب داشتہ و خود را بہ فنائی فی الشیخ مے نگاشت"

(دیوان غنی قلمی)

اسی طرح فانی کے ایک ہم عصر مرزا محمد طاہر (ف ۱۰۶۶ھ) غنی کی تاریخ وفات میں فانی کی عظمت اس طرح بیان کرتے ہیں۔

چو داد شیخ فیض صحبت شیخ کامل محسن فانی — غنی سر حلقہ اصحاب او در نکتہ دانی شد
تہی چون کرد بزم شیخ را گفتند تاریخش — کہ آگاہے سوئے دار البقا از دار فانی شد

بعض تذکرہ نویسوں نے شیخ یعقوب صرفی کو فانی کا استاد تسلیم کیا ہے (مجمع النفائس قلمی سراج الدین علی خان آرزو، اودھ کیٹلاگ صفحہ ۲۹۳ ڈاکٹر اشپرنگر) ڈاکٹر امیر حسن عابدی صدر شعبہ

فارسی دہلی یونیورسٹی کی بھی یہی رائے ہے (مثنویات فانی صـ۵)۔ راقم الحروف کو ان لوگوں سے اختلاف ہے کیونکہ شیخ صرفی کا انتقال ۱۰۰۳ھ مطابق ۱۵۹۵ء میں ہوا (منتخب التواریخ ملا بدایونی، دیوان منتخب سراج اورنگ آبادی)۔ فانی اس زمانے میں پیدا ہی نہیں ہوتے تھے۔ ڈاکٹر عابدی کا یہ کہنا غلط ہے کہ صرفی کا انتقال ۱۰۱۳ھ مطابق ۱۶۰۶ء میں ہوا (مثنویات فانی صـ۵)

فانی کے استاد کے بارے میں بہ تحقیق کچھ معلوم نہ ہوسکا۔ البتہ اکتساب علوم دینی کے سلسلے میں وہ مثنوی ناز و نیاز میں اپنے استاد کا نام نظام الدین محمد شیخ میرک بتاتے ہیں ؎

کہ بود استاد من خوش طبع و زیرک نظام الدین محمد شیخ میرک
درین عصر اہل دین را رہنما اوست چراغ دودمان مصطفیٰ اوست

مرزا محمد داراب جویا کشمیری (ف ۱۷۰۶ء) نے شیخ میرک کی ہجو کہی ہے۔

شیخ میرک کہ از راہِ دانش سند عز و شان مقامش شد
بسکہ کوچک بلی کند با خلق کاف تصغیر جزو نامش شد (کلیات جویا)

فانی کی ولادت کسی تذکرہ یا کتب تاریخ میں راقم کی نظر سے نہیں گزری۔ ڈاکٹر محی الدین صوفی نے ان کا سال پیدائش اٹکل پچو ۱۰۲۳ھ مطابق ۱۶۱۵ء میں قرار دیا ہے۔ فانی علوم متداولہ کی تحصیل کے بعد بلخ چلے گئے۔ اور وہاں نذر محمد خان والی (ف ۱۰۶۱ھ) کی تعریف میں قصیدے کہے بلخ میں کچھ عرصہ قیام کرنے کے بعد وہ ہندوستان واپس آگئے یہاں شاہزادہ دارا شکوہ نے غیر معمولی صلاحیتوں کے پیش نظر فانی کو الہ آباد کی صدارت یعنی جج کے عہدے پر فائز کیا۔ الہ آباد میں ہی فانی نے تصوف میں شیخ محب اللہ (ف ۱۰۵۸ھ) کے ہاتھ پر بیعت کی تھی (کشیر جلد دوم صـ۳۶۶ مفتاح التواریخ صـ۲۷۵)

ڈاکٹر اشپرنگر اور تھامس ولیم بیل کہتے ہیں کہ فانی کچھ عرصے کے لئے الہ آباد میں صدارت کے عہدے پر مامور تھے۔ جب شاہ جہاں نے ۱۰۵۶ ہجری مطابق ۱۶۴۶ء میں بلخ فتح

کیا تو مالِ غنیم کے علاوہ دیوانِ فانی کا ایک نسخہ بھی ان کے ہاتھ آیا۔ اس میں فانی نے نذر محمد خان کی مدح میں قصیدے بھی کہے تھے۔ شاہ جہاں فانی کی اس دو رخی سے چراغ پا ہو گئے اور انہوں نے فانی کو عہدہ صدارت سے معزول کر دیا۔ صدارت کے عوض فانی کے حق میں کچھ وظیفہ مقرر کیا۔ وہ معزولی کے بعد کشمیر میں آ کر رہے (اودھ کیٹلاگ ص ۲۹۳، مفتاح التواریخ ص ۲۷۵)

ڈاکٹر صوفی (کشمیر ص ۳۶۶ جلد دوم) کہتے ہیں کہ معزولی کے بعد فانی خراسان گئے واپسی پر انہوں نے سرینگر میں خانقاہ دارا شکوہ میں گوشۂ تنہائی اختیار کیا۔ اس عالم میں بھی ان کو دلی کی یاد آتی تھی۔ کہتے ہیں۔

فانی آخر منزوی در گوشۂ کشمیر شد　　گرچہ جائے بہتر از شاہِ جہاں آباد نیست

فانی دارا شکوہ (ف ۱۶۵۹ء) اور محب اللہ آبادی کے مرید خاص تھے۔ دونوں کے ساتھ بڑا خلوص وارتباط تھا۔ فانی اور دارا شکوہ مذہبی معاملات میں ایک ہی مکتب فکر و خیال کے اولوالعزم مجدد تھے۔ فانی ان کی تعریف میں یوں رطب اللسان ہیں ؎

فانی کہ سجدۂ درِ دارا شکوہ کرد　　دیگر سرش فرود بہ ہر در نمی شود

محب اللہ آبادی کی مدح میں کہتے ہیں ؎

ہمت گروں خلوتی از خانقاہِ پیر ماست　　از گدا تا شہ مریدِ پیر عالم گیر ماست

سلطان قطب الدین نے اپنے عہد حکومت (۱۳۷۳ تا ۱۳۸۹ء) میں صدر مقام قطب الدین پورہ (حال گرگاڑی محلہ) سرینگر میں قرآن و حدیث کے مطالعہ کے لئے اپنے نام پر ایک یونیورسٹی "مدرسۂ قطبیہ" قائم کی تھی۔ اس کے سربراہ پیر محمد حاجی قاری تھے۔ مدرسہ کے متعلق ایک دار الاقامہ یعنی ہوسٹل بھی تھا جس میں اساتذہ اور طلبہ کے قیام و طعام کا مفت انتظام تھا۔ اس کا نام لنگرہٹہ رکھا گیا تھا۔ یہ مدرسہ سکھوں کے عہد حکومت تک قائم رہے لیکن سرکاری سرپرستی کی عدم توجہ کے باعث اس کو بند کرنا پڑا۔ جہانگیر کے زمانے میں ملا جوہر ناتھ اس کے پرنسپل تھے۔ محسن فانی اسی مدرسہ میں اپنے شاگردوں کو

درس و تدریس دیتے تھے ان غنی کشمیری، محمد زماں نافع (برادر غنی کشمیری) خواجہ قاسم ترمذی اور ملا محمد کا درسہ سرفہرست تھے (کشمیر ص ۳۲۶ جلد دوم)

فانی سرینگر میں قطب الدین پورہ میں رہتے تھے۔ جس مکان میں قیام پذیر تھے اس کا نام "حوض خانہ" تھا۔ امیر شیر خان لودی کہتے ہیں:

"درمیان باغیچہ حویلی نشیمنے مربع با حوض سنگین ساختہ۔ حوض خانہ نام کردہ بود۔ ہنگام نصف النہار آں جامی نشست" (مراۃ الخیال قلمی)

ظفر خان احسن اس زمانے (۱۶۴۱ء ـــ ۱۶۴۹ء) میں کشمیر کے صوبیدار تھے۔ وہ فانی پر مہربان تھے اور دونوں میں خوب گاڑھی چھنتی تھی۔ فانی ان کی تعریف میں کہتے ہیں ؎

بہار گلشن کشمیر باز رنگین شد　　　که ابر فیض ظفر خان کامگار آمد

کچھ دنوں کے بعد دونوں کے تعلقات کشیدہ ہو گئے۔ وجہ مخاصمت یہ ہوئی کہ فانی ایک کشمیری طوائف نجی پر دل باختہ ہو گئے تھے۔ وہ حسن و جمال اور رعنائی و زیبائی میں چندے آفتاب چندے مہتاب تھیں۔ ظفر خان بھی نجی کی طرف محبت کی پینگ بڑھانے لگے لیکن وہ انہیں خاطر میں نہیں لاتی تھیں۔ اس پر فانی اور ظفر خان میں حسد کی آگ بھڑکنے لگی اور دونوں ایک دوسرے پر گندگی اچھالنے لگے۔ آخر کار ظفر خان نے نجی اور ملا فانی کی ہجو میں ایک غزل کہی۔ دو شعر حاضر ہیں ؎

خفتہ را بیدار سازد باد دامان نجی　　　مردہ را در جنبش آرد بوئے انبان نجی

لتہ حیض نجی شد رشتہ شملہ دستار شیخ　　　رشتہ تسبیح او شد باد تنبان نجی

فانی اس کے جواب میں کہتے ہیں (مفتاح التواریخ ص ۲۷۵)

گو ظفر خان داغ شو امشب کہ فانی این غزل　　　در الہ آباد پیشش قدر دانی خواندہ است

آخر کار فانی ظفر خان سے بیزار ہو کر دہلی چلے گئے۔ مگر وہاں کشمیر کی آب و ہوا ستاتی رہی ؎

در بہار گلشن کشمیر فانی ہر طرف　　　جز شراب ناب شمع مجلس احباب نیست

فانی کو اپنے وطن کشمیر سے بڑی محبت تھی جہاں کہیں بھی جاتے تھے کشمیر کو یاد کرتے تھے۔

درکتابتھائے کشمیر از زبانِ آہِ سرد شکوہ ہا از کوئے ہندوستان می باید شنید
فانی از کثرتِ سیاحت شدہ دربندِ وطن ورنہ جائے تو بجز گوشہ کشمیر نبود

ایک اور جگہ کہتے ہیں ؎

ہوائے برشگالِ ہند خوش آمد مرا لیکن نسیم نوبہار کابل و کشمیر می باید

داراشکوہ اور سرمد کے قتلِ عام کے بعد جب اورنگ زیب ۱۶۶۳ء میں کشمیر اپنے لاؤ لشکر کے ساتھ وارد ہوئے تو انہوں نے محسن فانی کو اپنے پاس بلایا۔ انہیں ایک خاص خلعت سے نوازا اور مبلغ دو ہزار روپیہ نقد انعام دیا۔ اس کے علاوہ تنخواہ بھی مقرر کی (صحف ابراہیم قلمی و غیر مطبوعہ نسخۂ پٹنہ)

ملا فانی کو شراب اور افیون کی عادت تھی۔ ملا مقیم بلخی (ف ۱۶۷۰ء) ان کو پسند نہیں کرتے تھے چنانچہ ایک جگہ فانی کی ہجو میں کہتے ہیں ؎

کم ز جام بادہ نبود ہر گلے از کوکنار زیب دہا مسال فانی کار می افیوں کند

وفات ۔ خواجہ اعظم دیدہ مری (واقعات کشمیر صفحہ ۱۷۰) کہتے ہیں کہ فانی نے آخری عمر میں مرضِ موت میں توبہ و استغفار کی تھی اور اپنے کئے پر پچھتائے۔ ڈاکٹر اشپرنگر (اودھ کیٹلاگ صفحہ ۳۹۳) تھامس ولیم بیل (مفتاح التواریخ صفحہ ۲۷۵) قدرت اللہ گوپاموی (نتائج الافکار صفحہ ۵۴۲) اور ڈاکٹر طیبی (مثنویات فانی مطبوعہ کلچرل اکادمی سرینگر) نے فانی کا سال وفات غلطی سے ۱۰۸۱ھ قرار دیا ہے۔ دراصل ان کا انتقال ۱۰۸۲ ہجری میں ہوا۔ اور انہی کے ایک مصرعہ سے مادۂ تاریخ نکلتا ہے۔ مصرعہ یہ ہے

"رفتہ فانی بعالم باقی" (واقعات کشمیر صفحہ ۱۷۰)

۱۰۸۲ ہجری

ڈاکٹر صوفی (کشمیر صفحہ ۳۶۵ جلد دوم) نے مادہ تاریخ یوں غلط لکھا ہے۔ "رفت فانی بعالم فانی" اس سے ۱۰۷۷ ہجری کا سال نکلتا ہے۔ البتہ انہوں نے ہندسوں میں ۱۰۸۲ ہی لکھا ہے۔ فانی اپنے مکان کے

باہر اپنے ہی صحن میں (واقع قطب الدین پورہ متصل خانقاہ ملا شکوہ زینہ کدل) دفن ہیں (کشیر ص ۳۶۵) مرنے کے بعد دو بیٹیاں چھوڑیں۔ ایک خواجہ قاسم ترمذی اور دوسری محمد کاوسہ سے منسوب تھیں (واقعات کشمیر ص ۱۷۰)

شاگردوں میں غنی کشمیری، نافع اور اسلم کا ذکر تذکروں میں ملتا ہے۔

شاعری۔ فانی فارسی کے کہنہ مشق استاد ہیں۔ ان کی دھوم چار دانگ عالم میں مچی تھی۔ شہرت و عظمت کے لئے یہ کیا کم ہے کہ وہ فارسی کے بلند پایہ شاعر غنی کشمیری کے استاد تھے۔ محمد صالح کنبو فانی کے ہمعصر تھے۔ وہ وہ کلام فانی پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"جلوہ سنج حسن کلام است۔ و مانندِ بہار در کشمیر صاحبِ مقام شاہدانِ معنی را با حسن وجوہ بر صفحۂ بیان جلوہ می دہد۔ و سرِ انگشت قلمش عقدہ از سر رشتۂ معانی بہ نیکوترین وصفی می کشاید۔ فکرش آرائش دِہ دیوانِ سخن است۔ و کلکش چہرہ آرائے بتانِ معنی فیض اندوز کمالات طبعی والٰہی بودہ۔ اوجِ گرامی بجمیع علوم است و شاعری دوں مرتبہ آں والا فطرت است۔ و ستمنوری کمین پایۂ آں بہیں سردار خطۂ فکوت است۔ چوں بعض اوقات بفکر شعری پردازد و طرۂ اشعار را بشانۂ قلم می طرازد۔ لاجرم نام آں عالی مرتبت در جرگۂ شاعران بقلم آوردہ" (عمل صالح جلد ۳ ص ۴۱۶)

تذکرہ نویسوں میں غالباً سب سے پہلے محمد طاہر نصر آبادی ہیں جنہوں نے فانی کا ذکر کیا ہے۔ تذکرۂ نصر آبادی ۱۰۸۳ ہجری میں ختم ہوا تھا۔ مولف تذکرہ نے فانی کا ذکر صیغۂ حال میں کیا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ فانی کا ترجمہ ان کی زندگی میں ہی لکھا گیا تھا۔ تذکرے میں سہو کتابت سے فانی کے بدلے فنائی لکھا گیا ہے چنانچہ لکھا ہے "فانی غنی کے استاد ہیں۔ اور آجکل کشمیر میں ہیں"۔

فائقی کرمانی اکبر کے زمانے میں ایک نامور شاعر تھے۔ انہوں نے تذکرۂ دولت شاہ سمرقندی کو منظوم لکھا اس میں تین طبقات کا اضافہ کیا۔ یعنی سات طبقات سے دس تک بڑھا دیئے۔ ان کے بعد اورنگ زیب کے زمانے میں لطف اللہ محمد مہندس بن احمد نے تذکرۂ دولت شاہ کا منظوم خلاصہ ترتیب دیا۔ اس

میں دو برج کا اضافہ کیا۔ اور کتاب کا نام آسمان سخن رکھا مولف بارہویں برج میں فانی کے شاعرانہ کمال کو

اس طرح سراہتا ہے۔ ؎

دیگر سخنور کشمیر محسن فانی است — بقلمرو نظام وے از دولت سخن وانی است[1]

تذکرہ نویسوں نے فانی کے کلام کی خوب داد دی ہے۔ ذیل میں اختصار کے ساتھ چند اقتباسات دیے جاتے

ہیں۔ سرخوش (کلمات الشعرا قلمی ۲ الف ب)

"شیخ فانی از اکابر کشمیر صوفی مشرب بودہ۔ از مصاحبان دارا شکوہ، دیوان و مثنوی خوب دارد"

شیر خان لودی (مراۃ الخیال قلمی)

"فانی ..... فاضل تبحر و صاحب جاہ و پاکیزہ روزگار، خوش گفتگو خوش صحبت بودہ"

میر وزیر علی عبرتی (ریاض الافکار قلمی)

"فانی خیلے سخن رس و خوش تقریر بود صحبتش را در کشمیر رشک افزاے گل و گلزار می توان انگاشت"

خان آرزو (مجمع النفائس قلمی)

"فانی۔ در فضل و کمال و شعر شاگرد ملا صرفی است۔ خیل اہل کمال از دامن تربیت او بر خاستہ اند"

مولوی قدرت اللہ گوپا موی (نتائج الافکار ص۵۴۱)

"فانی گنجینہ مضمون نکتہ دانی، شیخ محسن فانی کا از اعیان کشمیر است۔ در فضل و کمال بے نظیر، تکمیل

علوم و فنون از ملا یعقوب صرفی کشمیری نمود۔ و طریق اصناف بکوشش تلاشی می پیمود۔ و بجوہر ذاتی و صفاتی مستعد

بارگاہ شاہ جہاں گشتہ بحسن خلق و ستیمہ رسیدہ در آں دیار مرجع خاص و عام گردید۔ حاکم صوبہ و اکابر شہر

بملاقاتش می رفتند۔ اوقات گرامی پیوستہ بشغل درس و تدریس ماموری داشت و از حلقہ تدریس با فاکثے

از اہل کمال مثل محمد طاہر غنی و حاجی اسلم سالم علم شہرت برافراشتند"

آزاد بلگرامی (خزانہ عامرہ قلمی)

"فانی از اہالی کشمیر است۔ درویش صوفی مشرب، صاحب دیوان بودہ، و با دارا شکوہ مصاحب

---

[1] اودھ کیٹلاگ ص ۱۱۶

داشتہ و غنی کشمیری بخدمت وے کمالات کردہ از منظومات اوست مصدر الآثار"

سید علی حسن خان (روز روشن)

"فانی از خوشنوایانِ خطۂ دل پذیر۔ وے در تلامذۂ ملا یعقوب صرفی کشمیری، ناقد النظیر و بلیغیں شاگردی وے در سخن سرائی مرتبۂ استادی کار رسیدند۔ و وے در اکثر علوم علم یکتائی می افراشت"

مندرجہ بالا تذکروں کے علاوہ کشن چند اخلاص (تذکرۂ ہمیشہ بہار قلمی) والہ داغستانی (ریاض الشعرا قلمی) حسین علی خان عاشقی (نشتر عشق قلمی) اور شیخ احمد علی سندیلوی (مخزن الغرائب قلمی) نے بھی فانی کی شاعرانہ خوبیوں اور ان کے کمال کو سراہا ہے۔

تصانیف ۔ فانی کو جملہ اصناف سخن میں مہارت حاصل تھی۔ انہوں نے غزلیں، مثنویاں، قصیدے اور رباعیاں کہیں۔ دیوانِ فانی کا ایک نسخہ شاہان اودھ کے کتب خانے میں تھا۔ جو اب ناپید ہے۔ اس میں صرف غزلیں تھیں جن کی تعداد تقریباً سات ہزار تھی (اودھ کیٹلاگ صفحہ ۲۹۳) تھامس ولیم بیل نے بھی اشعار کی تعداد یہی بتائی ہے (اورینٹل بیوگرافیکل ڈکشنری صفحہ ۲۵۶) کلیات فانی کا قدیم ترین نسخہ کتب خانۂ رامپور میں محفوظ ہے اس کا سال کتابت ۱۰۷۲ھ ہے ڈاکٹر عابدی فانی کے اشعار کی تعداد ۱۳۱۴۱ بتاتے ہیں۔ موصوف نے ان کی چار مثنویاں کلچرل اکادمی سرینگر سے شائع کرائی ہیں۔ تفصیلات درج ذیل ہیں۔

(۱) **نازونیاز**:۔ یہ تاریخی عشقیہ مثنوی ہے۔ انجام اس کا المناک پیرایہ میں ہوا ہے۔ ابتدا میں عشق کے کرشموں اور کارناموں کا مفصل ذکر ہے۔ اس حصے میں زلیخا یوسف، لیلیٰ مجنوں، شیریں فرہاد، نل دمن اور محمود و ایاز کے عشقیہ قصے بیان کئے گئے ہیں۔ اس کے بعد حمد الٰہی، نعت پیغمبر آخر زماں اور اصحاب کی تعریف میں اشعار ہیں۔ مناقب کے بعد نظام الدین، محمد شیخ میرک، محب اللہ الہ آبادی اور دیگر صوفیا کا ذکر کیا گیا ہے۔

نازونیاز کے واقعے کا ذکر ملا بدایونی نے فانی سے لگ بھگ ایک سو سال قبل منتخب التواریخ

جلد دوم میں تفصیل سے کیا ہے۔ فانیؔ نے اسے نظم کا جامہ پہنایا۔ وہ اس مثنوی کو ایران، توران اور اصفہان کے لئے بیش بہا تحفہ سمجھتے تھے۔ آخر میں مرزا محمد صائب (ف ۱۰۸۰ھ) کو بھی یاد کرتے ہیں ؂

کتابے کردہ ام در عشق تصنیف — کہ باشد بے نیاز از جلد تعریف
چو دیدہ از خطِ او نورِ معنی — کلیش نام کردہ طور معنی
قبولش گر کنند ایں شعر فہماں — شود مشہور در ایران و توران
در اندک فرصتی از سرمہ آں — کنند روشن سوادِ خود صفاہاں

بصائب ہم دعائے من رساند
کہ قدر ایں دعا او نیک داند

مثنوی ۱۰۶۲ ہجری میں تصنیف کی گئی تھی۔ فانیؔ نے خاتمے میں تاریخ لکھی ہے ؂

چو ایں افسانہ را ترتیب دادم — بجست و جوئے تاریخش فتادم
بگوشم گفت ہاتف از عنایت — رقم زد کلکِ فانی ایں حکایت

۱۰۶۲ ہجری

مثنوی ناز و نیاز کی زبان سادہ، شگفتہ اور شیریں ہے۔ اس میں شعری خوبیاں بکثرت پائی جاتی ہیں یعنی شاعر کو ندرت تشبیہ اور لطفِ استعارہ برتنے میں قدرت تامہ حاصل تھی۔ ذیل کے اشعار میں موہنی کا سراپا لطیف پیرایہ میں بیان کیا گیا ہے ؂

قدش سروِ ریاضِ حسن و خوبی — بپایش سر نہادہ نخلِ طوبیٰ
زبانش بود گویا کانِ مصری — زوندانش خجل دندانِ مصری
چو شاخ نیشکر شیریں زباں بود — نبات کالپی مشہور زاں بود
لبش از خط زدہ ہر لحظہ چشمک — بشیریں کاریِ حلوائے پشمک
براں لب جا گرفتہ نقطۂ خال — زباں چوں برگ پاں در وصف او لال

مثنوی میں کالپی کے ایک جواں سید موسیٰ اور ایک زرگر کی صاحبزادی موہنی کی داستانِ عشق نظم کی گئی ہے۔ "نازونیاز" کے تتبع میں فارسی اور اردو میں کئی مثنویاں نظم کی گئی ہیں۔ ان میں مقیمی کی چندر بدن، ولّلہ کی طالب موہنی، تراب دکنی کی عاشق صادق اور میر کی دریائے عشق قابل ذکر ہیں۔

(۲) **مَصدرُ الآثار** :- مصدر الآثار مثنوی کا تاریخی نام ہے جس سے ۱۰۶۷ ہجری کا سال برآمد ہوتا ہے۔ ذیل کے اشعار میں مثنوی کا سال تصنیف نظم کیا گیا ہے

مصدر الآثار زبس نام اوست   یک اثرش صورتِ اتمام اوست
۱۰۶۷ھ
ماندہ زمن نسخہ بسے یادگار   لیک ازیں نام شدم نامدار
بیوا اثر ہاشش چو از حد فزوں   آمدہ تاریخ ز نامش بروں

فانی کی یہ پیش گوئی درست نکلی ہے کہ "مصدر الآثار" سا نہیں شہرت ہوگی۔ اس کا ثبوت اس بات سے ملتا ہے کہ تذکروں میں صرف اسی مثنوی کا نام ملتا ہے۔

مثنوی میں آٹھ آثار کی فضیلت بیان کی گئی ہے اور وہ یہ ہیں، کلمۂ طیبہ، نماز، روزہ، حج، زکواۃ، توبہ، تواضع، توکل۔

مصدر الآثار خالص مذہبی مثنوی ہے۔ یہ نظامی کی "مخزن الاسرار" کی بحر میں کہی گئی ہے اور فانی نے اسے بادشاہ شاہ جہاں کے نام منسوب کیا ہے۔ مثنوی کے دیباچے میں انتساب کا ذکر درج ہے۔ بادشاہ کے بارے میں کہتے ہیں ؎

کہ از نامش سخن را اعتبار است   نگیں از نام شاہاں نامدار است
شہاب الدین محمد بو المظفر   کہ بر سر دارد از اقبال افسر
شہے کز عدل چوں نوشیرواں است   امیر المومنین شاہ جہاں است

مثنوی میں حمد الٰہی اور نعت رسولؐ کے بعد خلفا کی تعریف میں اشعار درج ہیں۔ مناقب کے بعد شاہجہاں نظامی گنجوی، امیر خسرو، مولانا جامی، شیخ صرفی اور شیخ محب اللہ الٰہ آبادی کی تعریف و توصیف کی گئی ہے۔

(۳) میخانہ:- مثنوی کا سال تصنیف معلوم نہیں ہو سکا اس میں تقریباً دو ہزار شعر ہیں۔ ابتدائی شعر یہ ہیں

بنام خدا ابتدا می کنم | کہ میخانۂ نو بنا می کنم
بشوئیم لب از مے چو پیر مغاں | بحمد و ثنائش کشائیم زباں

مثنوی میں فانی کے مسلح کل، قومی اتحاد، مذہبی رواداری اور آپسی بھائی چارہ پر بھی روشنی پڑتی ہے۔

کہتے ہیں ؎

چو مے ہمدم جام و مینا شوم | بہر مشربی تا گوارا کنم
بہ سنی دہم بادہ از چار جام | زمے تار ساند بیاراں سلام
کنم شیعہ را مست از یک قدح | کہ در یک قدح باشدش صد فرح
بہر کس نمایم رہے سوئے دوست | کہ آرد ز من یاد در کوئے دوست
برہ تا نمانند از ہم جدا | شوم رہنمائے ہمہ تا خدا
زدم از در صلح کل یک دم | دہم صلح اہل جہاں را بہم

بیا ساقی آں مایۂ صلح کل
بمن دہ کہ خنداں بنوشم چو گل

"میخانہ" میں فانی نے مینا و ساغر اور خمار چشم ساقی کے علاوہ کشمیر کے قدرتی مناظر یعنی دریاؤں، ندیوں، باغوں، سبزہ زاروں اور ڈل جھیل کی تعریف کی ہے۔

ڈل جھیل کی کیفیت:-

بہار آمد و مے پرستی کنم | چو بلبل دریں فصل مستی کنم
دریں فصل جائے چو کشمیر نیست | کہ آنجا کس از اہل تزویر نیست
ز جوش گل و لالہ و نسترن | ز باغ ارم خوشتر است ایں چمن
نہ دارد چو کشمیر باغ جناں | بروئے گل و سبزہ آب رواں

گروہ بردہ از سلسبیل آب ڈل — کہ رنگین شدہ از بہار آبِ کنول
گلشنِ آتش انداخت در آب ڈل — شد آتشکدہ روئے تالابِ ڈل
چو آتش کند تیز تالابِ ڈل — برو کار روغن کند آبِ ڈل
دریں فصل از غنچہائے کنول — شدہ منقل آتشی آبِ ڈل
کم از جام می نیست تالاب ڈل — کہ از عکسِ گل سرخ شد آب ڈل
چو کشتی تواں سیر ایں آب کرد — کہ عکسِ گلشن بادۂ ناب کرد
ز جوشِ گل و برگ سبز آب کنول — گلستان شدہ صفحۂ آب ڈل
فلک راسوادِ گلستانِ آب — شدہ روشن از عینکِ آفتاب
دریں فصل بر صفحۂ آب ڈل — کتابِ گلستان نوشتہ کنول
اگر کس کند سیر باغِ نسیم — نیارد دگر یاد باغِ نعیم
ز جوشِ گل و لالۂ ایں دو باغ — شدہ گلشنِ خلد فردوس داغ
عروس ہمہ باغہا شالہ مار — کہ او را گرفتہ است ڈل در کنار
چو در عیشِ آباد کردم عبور — دو بالا طرب شد دو چنداں سرور
ازیں باغہا بود باغ شاہ[1] — کہ فرق است از خانہ تا خانقاہ
در چشمۂ ہست دائم رواں — کہ نامش بود چشمۂ عارفان
چناں آب ایں چشمہ دارد اثر — کہ نوشندہ اش نیست بے چشم تر
نباشد عجب گر صفا پرور است — کہ سرچشمۂ دیدہ ہائے تر است
شنیدم شبے از لبِ دلبری — کہ ایں چشمۂ ہم بود چشم پری

---

[1] باغ شاہ — موضع درند پرگنہ پھاگ میں دارا شکوہ نے اپنے استاد ملا شاہ بدخشی کی خواہش پر پہاڑ کی بلندی پہ آباد کیا تھا۔ بیچ میں ایک نہر بھی جاری تھی۔ تعمیرات پختہ کے آثار اب تک موجود ہیں۔ باغ میں فواروں کے علاوہ ایک حوض بھی تھا۔

دریں باغ ہر گوشہ فوارہ ہا
بگردوں بر آوردہ دستِ دعا

زعکس گل و پرِ تو آفتاب
شدہ ہر یکے ہمچو تیرِ شہاب

چو تیرِ دعا رفتہ بر آسماں
سزد آبش از جدول کہکشاں

نہ تنہا ازو بہرہ در حوض و جوست
کہ در جدولِ کہکشاں آب ازوست

بود حوض او حوضۂ فیلِ کوہ
سزد گر بود جائے داراشکوہ

مگر حوض او حوض کوثر بود
کز آبش لبِ عارفاں تر شود

دریائے جہلم کا منظر

چو کردم رہ خانۂ خویش یاد
چو کشتی رہم در بہت[1] اوفتاد

براطراف ایں نہر اہل دیار
برافراشتہ خانہ ہا چوں چنار

چو در باغ سیتم گزار اوفتاد
عبورم شہر و دیار اوفتاد

بباغ فتح چند کردم گزر
کہ از ہند یا بم در آنجا خبر

بود بر سر راہِ ہند ایں دو باغ
دریں باغہا آشیاں کردہ زاغ

چو چشمم شود روشن از باغ نور[2]
اگر صفحۂ گل بخواہم چہ دور

دریں فصل یک کس ز اہل سخن
نہ خواندہ کتابِ گلستاں چو من

چمن می کشد می ز مینائے ابر
کہ افتد سیہ مست دریائے ابر

دریں فصل جوش و خروشِ شراب
چو باراں کند خانہ ہا را خراب

درختاں رسیدند در باغ مست
زِ گل جام و از غنچہ مینا بدست

بدہ ساقی آں آتشِ نخلِ طور
کہ بزم حریفاں شود باغ نور

---

[1] کتب تواریخ میں دریائے جہلم کو بہت کہتے ہیں۔

[2] متصل عیدگاہ مغرب کی طرف واقع ہے۔ نورجہاں بیگم نے بنایا تھا۔ زونی مر کے راستے سے باغ میں ایک نہر بھی جاری تھی۔

موسم خزاں کی بہار۔

بیا ساقی آں ساغرِ می بیار — کہ فصلِ خزاں خوشتر است از بہار
بہار ایں چنیں نشہ کے می دہد — دریں موسم انگورِ مے می دہد
خزاں بسکہ در باغ آتش زدہ — سزد گر شود تاک آتش کدہ
نہ شد برگ تاک از خزاں خوشنما — کہ بستہ بکف دخترِ رز حنا
درختاں ز میخانہ مست آمدند — قدح ہائے صہبا بدست آمدند
ندا کردہ قمری ز بالائے سرو — کہ برگِ خزاں بہ ز بالِ تذرو
چمن ہمچو طاؤس رنگین شدہ — درختاں ہمہ مرغِ زریں شدہ
دریں موسم از می کشاں بہرہ جست — لبِ بادہ بینید چو طاؤس مست
درختاں کہ بودند سبزی فروش — ز فیضِ خزاں اند زربفت پوش
پیالۂ می شوق لب ریز شد — ز بادِ خزاں آتش تیز شد
چرا نہ شگفتہ دل ز بادِ خزاں — دریں فصلِ گل می کند زعفراں
رخِ شاہدانِ چمن گشتہ زرد — کہ بادِ خزاں می کشد آہ سرد
چرا می کشد بلبل از باغ رخت — کم از برگِ گل نیست برگِ درخت
چناں کردہ رنگین چمن را خزاں — کہ طاؤس صد داغ دارد ازاں
تماشائیاں را چو حیراں کند — ز برگِ درختاں چراغاں کند

موسم سرما کی کیفیت

کشمیر میں خزاں کے بعد موسم سرما کا آغاز ہوتا ہے۔ یہاں شدت کی سردی پڑتی ہے۔ درجہ حرارت نقطۂ انجماد سے کافی گر جاتا ہے۔ پانی جم کر یخ بستہ ہوتا ہے۔ ہر طرف برف کے تختے نظر آتے ہیں۔ لوگ سردی سے بچنے کے لئے طرح طرح کے انتظامات کرتے ہیں۔ گرم کپڑے اور آگ

زیادہ تر استعمال کی جاتی ہے شعراء عموماً بہار کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملاتے ہیں سردیوں میں یہاں کے لوگوں پر جو کچھ گزرتی ہے وہ خدا ہی جانتا ہے۔ شاذ و نادر ہی کوئی ہوگا جس نے چلۂ کلاں چلۂ خرد پر کچھ لکھا ہو۔ لکھتے بھی کیسے؟ باہر کے شعراء اپنے آقاؤں کے ساتھ کشمیر میں لطف اندوزی کے لئے آتے تھے۔ ہندوستان کی گرمی سے جھلس کر یہاں ان کے نئے بال و پر نکلتے تھے۔ عرفی کا شعر شاہد ہے۔

هر سوخته جانے که به کشمیر در آید | گر مرغِ کباب است با بال و پر آید

اگر انہیں موسم سرما میں یہاں رہنے کا اتفاق ہوتا تو یقیناً بے بال و پر ہو جاتے۔ فانی غالباً پہلے شاعر ہیں جنہوں نے موسم سرما کی صحیح تصویر پیش کی ہے ؎

درختاں ز سرما مشوش شدند | برہنہ در آغوش آتش شدند
چو از جامۂ برگ عریاں شدند | تہِ چادرِ برف پنہاں شدند
ز سرمائے خشکی کہ در گلشن است | گل افشانیِ نخل در گلخن است
چناں کردہ سرما رگ و در ریشہ سخت | کہ شد خشک خوں در تنِ ہر درخت
مہیا شد از بادِ برف و تگرگ | برائے نباتات اسباب مرگ
ز سرما چو میرد کسے در چمن | ز برفش تواں کرد گور و کفن
ز گرد دل رسیدہ زمین را بفرق | گہے تیرِ باراں گہے تیغ برق
حریفاں دریں فصل حیراں شدند | بے ساز و برگِ زمستاں شدند
یکے در پئے شیشہ و جام شد | یکے گرم تعمیر حمام شد
یکے پوستیں کردہ در بر چو موش | یکے گشتہ چل گرم قنز شال پوش
ز اہلِ چمن قمری و فاختہ | ز سنجاب و خز پوستیں ساختہ
چو در برف ساز و زمین رو نہاں | دم از سرد مہری زند آسماں
چو از ہر طرف بادِ سردی وزید | زمیں چادرِ برف بر سر کشید

زمیں از کجا آورد تاب برف
کہ از برف شد آسماں تنگ ظرف

فلک در زمستاں چو پوشش نہ داشت
بروئے زمیں پنبۂ برف کاشت

ز سرما مرا داد و فریاد نیست
کہ چوں بادہ باشد غم از باد نیست

نہ گرمی اثر نیست در ہیچ چیز
کہ یخ بستہ است آب آئینہ تیز

ازاں چشمِ آئینہ حیراں شدہ
کہ آئینہ داں ہمچو یخ داں شدہ

روانی نماند است در ہیچ آب
چساں آید از شیشہ بیروں شراب

چو آئینہ باید نمد پوش بود
ز بیم ہوا خانہ بر دوش بود

چناں کردہ سرما در آتش اثر
کہ شد گلخن از گلشن افسردہ تر

ز سرما شد از بسکہ آتش زبوں
نمی آید از کنج گلخن بروں

ازیں باد مہلک کہ جاں بردہ است
کہ آتش ہم از بیم او مردہ است

ز بس دید جاں بردن از باد دور
فرو رفت آتش بگورِ تنور

ز بس بر زمیں ژالہ و برف ریخت
سمندر ز سرما در آتش گریخت

دریں فصل از اہل دیں ہر کہ ہست
چو زردشتیاں گشتہ آتش پرست

دریں فصل کس جز و ناری نہ داشت
دم گرم غیر از بخاری نہ داشت

ز بس بزم می را ہوا کرد سرد
نہ خواہد جز آتش کسے گرم کرد

الہ آباد میں گنگا جمنا وغیرہ کی تعریف

فانی "میخانہ" میں گنگا جمنا کی تعریف میں رطب اللسان ہیں۔ ذیل کے اشعار ان کی رواداری اور صلح پسندی کی دلیل ہیں۔

بر آرم سر از کاہلی و بیاگ
ز چشمم فتد چشمۂ ویرناگ[1]

[1] ویرناگ۔ کشمیر میں ایک مشہور چشمہ کا نام ہے۔ کشمیری زبان میں "ناگ" چشمے کو کہتے ہیں۔ یہ بانہال کے اس طرف پرگنہ شاہ آباد میں، دامن کوہ میں پھوٹتا ہے اور پھر دریائے جہلم کی شکل میں سرینگر سے گذرتا ہے (بقیہ حاشیہ صفحہ ...)

پیاگ از دو دریا بود فیض یاب | درآنجا کمی نیست ہرگز ز آب
به دریائے خونخوار چوں عاشقاں | گرفتند ایں شہر را در میاں
دریں سر زمیں جمع شد جون وگنگ | شارہ از دو سو رو برو چوں پتنگ
چوں کشتی است ایں شہر بر روئے آب | دریں جا بود بادہ خوردن ثواب
عمارات دلکش درو بے حساب | چو سیماب لرزندہ از بیم آب
در اطراف ایں نہر ہا باغہا | چو کشمیر کردہ بترتیب جا
بہشت آرزو مند ہر باغ اوست | ارم را بسر لالۂ داغ اوست
چو در خلد آباد راہم فتاد | بگلزار جنت نگاہم فتاد
مکانے بہ از خلد آباد نیست | کسے را چنیں گلشنے یاد نیست

(بقیہ حاشیہ صفحہ نمبر ۲) مشہور و معروف کشمیری مورخ ملک حیدر چاڈورہ نے اس کے گرد ہشت پہلو کا ایک پختہ حوض ۱۰۲۶ ہجری میں جہانگیر بادشاہ کے حکم سے تعمیر کیا۔ اس کے ساتھ بڑی بڑی عمارتیں بھی بنائی گئیں۔ تاریخ یہ ہے۔ ؎

از جہانگیر شاہِ اکبر شاہ | ایں بنا سر کشیدہ بر افلاک
بانی عقل یافت تاریخش | قصر آباد و چشمۂ ورناگ

جہانگیر کے بعد شاہ جہاں نے ۱۰۵۵ھ میں ملک حیدر چاڈورہ کی نگرانی میں چشمے کے ساتھ ایک باغ اور کئی عمارتیں بنوائیں، باغ فواروں سے آراستہ کرایا۔ ذیل کی تاریخ ایک پتھر پر کندہ ہے۔

حیدر بحکم شاہِ جہاں پادشاہ دہر | شکر خدا کہ ساخت چنیں آبشار و جوئے
از جوئے دادہ است ز جوئے بہشت یاد | زیں آبشار یافتہ کشمیر آب روئے

تاریخ آب جوئے بگفتا سروش غیب
از چشمۂ بہشت برون آمد است جوئے
۱۰۵۵ ہجری

به از باغِ شیریں بود ایں چمن
که خسرو دریں جا گرفته وطن

نباید کسے در ریاضِ جہاں
ز شیرین و خسرو جز ایں جا نشاں

چساں کس کند وصفِ تر بینشیں
کہ چسپیدہ ہم لب ز شیرینیش

دریں دشت ہر سال چوں آب شور
شدہ جمع خوبان ہندوستاں

زفیض دو دریائے علم و عمل
ہمہ یافتہ آبرو از ازل

الہ باد میں پان کی تعریف

چو پان کس در اقلیم ہندوستان
نہ کردہ زبان در دہانِ بتاں

لب گل رخان سرخ از پان شود
گہر ہائے دندان چو مرجان شود

کمر بستہ از ہر طرف دلبران
بخوں خوردن خلق چو بیڑہ پان

بود بیڑہ پان نسخۂ دہ ورق
درو خواندہ خوبان بہ ہندی سبق

خطش از خط جبہہ پوشیدہ تر
ز معنی ورقہاش پیچیدہ تر

ازاں نسخۂ ہر صفحہ را پان فروش
سزد گر کشد مہرہ از درِ گوش

بہر صفحہ اش کردہ خوباں بہم
ز شنگرف کتھی وصفِ لبہا رقم

چو در وصف دندان قلم سر کنند
سفید آبِ آہک بلب تر کنند

سپاری ز بس حجم او دیدہ کم
ورقہائے ابرے باد کرد صنم

شد از نشئۂ بادۂ رنگ پان
سیہ مست خطِ لب گل رخان

نہ دیدم در ملکِ ہندوستان
زبان کسے سبز جز برگ پان

فانی نے "میخانہ" کے علاوہ قصیدوں میں بھی ہندوستانی الفاظ بکثرت استعمال کیے ہیں ؎

نو بہار آمد بسیر گلشن ہندوستان
زیبد ار طوطی بجائے پر بر آرد برگ پان

در چمن ہر صبح مینا می کند راگ بنت | نیست طوطی را بہ جز کلیان چو بلبل زبان
گل ز شبنم ہار چنبیلی بہ گردوں افگند | تا تواند شد حریف شاہ ہندوستان
سیم و زر را دام می گیرد ز چنبیلی و بیل | نرگس از بہر نثارِ ثانی صاحب قران

مثنوی میں فانی نے دعویٰ کیا ہے کہ انہیں شعر و شاعری کے علاوہ صرف و نحو، منطق، بدیع و بیان، معانی، فقہ، کلام اور اصول میں کامل دسترس ہے۔ شاعرانہ تعلّی ملاحظہ ہو۔

دوا تم چو فکر لآلی کند | بیک کوزہ صد بحر خالی کند
ازیں بحر رفتم بدریائے علم | کہ شویم بآب سخن پائے علم
زدم قطرہ در لجۂ صرف و نحو | کہ چوں قطرہ گردم دریں بحر محو
چو کشتی بدریائے منطق رسید | ز ہر سوئے بادِ مدادم وزید
ز دریائے علم بدیع و بیاں | برآوردہ چندیں گہر ہا زباں
بدریائے چوں غوطہ ہا بسکہ خورد | ز بحرِ معانی دلم فیض برد
زدم غوطہ در بحر فقہ و کلام | برآوردم آخر جواہر تمام
چو ماہی بدریا شنا کردہ ام | سر از بحر حکمت برآوردہ ام
برآوردم آخر فروغ و اصول | ز بحر کلام خدا و رسول

مثنوی کے آخری حصے میں فانی نے معاشرے پر کڑی نکتہ چینی کی ہے کہتے ہیں

دریں قوم از آن تو بہ معمول نیست | کہ از مردہ ہا تو بہ مقبول نیست
دریں مردہ ہا من ہم افتادہ ام | بخاکِ لحد نیز تن دادہ ام
مرا ہم فرو است جان در بدن | تن و پیرہن گشتہ گور و کفن
چو ایں مردہ ہا را دلم زندہ کرد | لبِ گور از خوشدلی خندہ کرد
کنوں دادہ ہر یک وجودے بجوش | بگرداں کشی کار خود بردہ پیش

یکے بر سرِ تخت روزِ جلوس | زدہ تاج بر سر لیاں خروس
یکے کروہ دعوی فضل و ہنر | شدہ زیر بارِ کتب ہمچو خر
یکے لاف شیخی زدہ در جہان | چو شیطان شدہ رہزن ابلہان

یکے قاضی شہر اسلام شد
کہ از رشوتش شرعِ بدنام شد

(ط) ہفت اختر

ڈاکٹر اشپرنگر نے اودھ کیٹلاگ میں شیخ محسن فانی کشمیری کے علاوہ خواجہ محمد دیدار تخلص فانی کا بھی ذکر کیا ہے۔ وہ اکبر کے زمانے میں ایران سے ہندوستان آ گئے اور یہاں بڑے جاہ و جلال سے رہتے تھے۔ ان کا انتقال ۱۰۱۶ھ ہجری میں ہوا۔ ڈاکٹر اشپرنگر نے نمبر ۲۰۲ کے تحت فانی ایرانی کی تصنیف "ہفت دلبر" کا ذکر کیا ہے۔ بقول اشپرنگر "ہفت دلبر" سات حکایتوں کا مجموعہ ہے۔ جو فانی نے ہفت شب میں مکمل کر کے شہنشاہ اکبر کے نام منسوب کیا۔

جس طرح محسن فانی کی مثنوی ناز و نیاز کا ماخذ سید شاہی بہادر سید موسیٰ کی مثنوی "دلفریب" ہے۔ اسی طرح ممکن ہے کہ فانی کشمیری نے بھی ایرانی فانی کی مثنوی "ہفت دلبر" کے تتبع میں ہفت اختر تصنیف کی ہو۔ وہ ایک جگہ کہتے ہیں۔ ؎

چوں درو وصفِ ہفت دلبر کرد | نام او خامہ ہفت اختر کرد

"ہفت دلبر" کا کوئی نسخہ راقم کی نظر سے نہیں گزرا۔ اس لئے اس کے بارے میں مزید کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

فانی کشمیری نے بھی "ہفت اختر" ہفت شب میں تصنیف کی کہتے ہیں ؎

ہفت شب تا سحر دریں نامہ | ہفت افسانہ زد رقم خامہ

ہفت اندام پیکر حسن است — فلک ہفت اختر حسن است
در جہاں ہمچو او کتابے نیست — ہفت اقلیم عالم معنی است
ہفتہ عمر صرف آں کردم — ہفت گوہر بہ نظم آوردم
ہر کہ خواند کتاب ہفت اختر — چوں منجم دہد ز غیب خبر

ہفت اختر کا سال تصنیف ۱۰۶۸ھ ہجری ہے۔ مثنوی کے آخر میں تاریخ درج ہے ؎

دائم ایں نسخہ در ہمیں کار است — ہفت اختر ہمیشہ سیار است
از نسیم بہار نامۂ من — ہمہ جا سبز شد زمین سخن
بہر تاریخ نظم ایں نامہ — خواستم مصرعی من از خامہ
گفت در گوش صفحہ پنہانی
"کردہ ایں نامہ را رقم فانی"

۱۰۶۸ ہجری

ہفت اختر کے سبب تالیف میں فانی نے ان تین مثنویوں کا بھی ذکر کیا ہے جو اس سے قبل تصنیف کی تھیں۔

پیش ازیں درمیان اہل سخن — داشت شہرت سہ مثنوی از من
برزباں ہا است حرف ایں سہ کتب — سبز ہمچو سہ برگ برلب آب
اول از آسمان عشق مجاز — شدہ نازل کتاب ناز و نیاز
ثانی آں سہ نسخہ میخانہ — کز میش گشتہ عقل دیوانہ
ثالث آں سہ مصدر آثار — ہست بر وزن مخزن اسرار

تینوں مثنویاں یکے بعد دیگرے تین سال میں تصنیف کی گئی تھیں ؎

درسہ سال ایں سہ نسخہ کردہ رقم — لنگ شد عاقبت دو پائے قلم

ابتدا میں معمول کے مطابق فانی نے حمد الٰہی، نعت رسول اور خلفائ کی تعریف کی ہے اس کے بعد سبب تالیف ہے اور پھر اورنگ زیب کی مدح میں ۱۰۸ اشعار ہیں ؎

شاہ اورنگ زیب ملک ستاں — کربود حکم او چو آب رواں
فیض آں بادشاہِ عالم گیر — ہند را کرد سبز چوں کشمیر

مدح اورنگ زیب کے بعد قصہ کا آغاز ہوتا ہے۔ مثنوی میں شاہ ایران اور ملک چین کی شہزادی خورشید کی داستان عشق بیاں کی گئی ہے۔ شاہ ایران کا نام جمال اللہ ہے۔ مثنوی بڑی دلچسپ ہے۔ جب بادشاہ کا ایلچی ہلال کشمیر آتا ہے۔ تو کشمیریوں کی تعریف اس طرح کرتا ہے ؎

اہل آں شہر اہل فضل و کمال — خورش و پوشش است شالی و شال
اہل معنی درد زحد بیروں — صاحب لفظ از عدد بیروں
ہمہ خوش طبع و خوش دل و خوشخو — ہمہ خوش فہم و خوش خط و خوش گو
چوں ہلال ایں چنیں مکانے دید — ہمچو بدر از طرب بخود بالید

ہلال جب یہاں سے لداخ کی طرف چلا گیا تو اس کو تحفہ کے طور پر شال بھی دیئے گئے تھے۔

دبستان مذاہب۔ فانی کی تصنیف نہیں ہے۔

ڈاکٹر صوفی نے اپنی کتاب کشمیر جلد دوم (ص ۳۶۶ تا ص ۳۷۰) میں سر ولیم جونس کے مقالے مورخہ ۱۹ فروری ۱۷۸۹ء اور لیڈن کے دبستان مذاہب کے انگریزی ترجمہ مطبوعہ ۱۸۰۹ء کی بنیاد پر یہ رائے قایم کر لی کہ ملا محسن فانی نے سری نگر میں خانقاہ دارا شکوہ میں دبستان مذاہب ۱۰۵۵ ہجری مطابق ۱۶۴۵ء میں تصنیف کی۔ اقبال بھی اسرار خودی کے پہلے ایڈیشن ۱۹۱۵ء کے دیباچے میں دبستان مذاہب کو فانی کی ہی قرار دیتے ہیں۔ ابوالکلام آزاد کی بھی یہی رائے تھی[1]۔ ڈبلیو[2] ایتھے[3] اور

ایوانوف کو فانی کی اس نام نہاد کتاب سے انکار ہے جناب قاضی عبدالودود صاحب کی بھی یہی رائے ہے کہ دبستان مذاہب سے فانی کو دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔ راقم الحروف نے بھی اس سلسلے میں بڑی کاوش و جستجو کی لیکن دبستان مذاہب کے مصنف کے بارے میں کوئی ٹھوس شہادت دستیاب نہ ہو سکی۔

لکھنو یونیورسٹی کے کتب خانے میں دبستان مذاہب کا ایک مخطوطہ زیر نمبر P/ 297 / 7 [illegible] محفوظ ہے اس کا سائز ½7 × 12″ فی صفحہ ۲۳ سطر، صفحات ۳۵۱ ہیں فہرست مخطوطات فارسی میں یہ نسخہ محسن فانی کے نام سے درج ہے۔ کتاب کے ص ۳۴۲ سے ص ۳۵۱ تک دبستان کی فرہنگ حروف تہجی میں شامل ہے۔ اس کے بعد مخطوطے کے ساتھ ہی ص ۱ سے ص ۳۵ تک تذکرۂ علماء شامل ہے یہ بھی اسی کاتب کا ہے جس نے دبستان مذاہب لکھی ہے کاتب کا نام عبدالقادر بن حاجی محمد غالب مرحوم ہے ص ۳۵۲ میں کاتب کا نام اور اس کے دستخط ثبت ہیں۔ راقم الحروف کی نظر سے پوری کتاب میں مصنف کا نام کہیں نہیں گزرا۔ البتہ آغاز کتاب میں جو تاریخ مشتمل [illegible] مقطع میں موبد تخلص درج ہے۔ ذیل میں مطلع اور مقطع پیش کیا جاتا ہے ؎

مطلع ۔ اے نام تو سر دفتر اطفال دبستان — یاد تو بہ بالغ خرداں شمع شبستان

مقطع۔ دریافتہ دریافت کہ دریافت جز ایں نیست — موبد حق ادیب تو وگیتی ادبستان

کاتب نے ص ۳۵۲ میں ترقیمے میں کتاب کے مصنف کا نام شیخ ابوالفضل لکھا ہے۔ عبارت یہ ہے:-

" الممتحان من اللہ تعالیٰ از کار نگارش نگارستان و دفتر اذکار و روشن عجائب کتاب دبستان مذاہب و درس و دقائق و حقائق نکات آیات مظاہر مطالب صاحب کتاب

---

۱ نقوش ص ۹ مرتبہ عرش ملسیانی

(2) CATALOGUE OF THE PERSIAN MSS. VOL I. P.41

(3) " " " " " BRITISH MUSEUM

(4) CONCISE DESCRIPTIVE CATALOGUE OF THE PERSIAN MSS P.544 (1924)

عالی انساب معلی القاب و ظل یکتائے زمانہ و عالم علمائے یگانہ منشی دفتر و دبیر بے نظیر کار آگہی شیخ الشیوخ مولانا ابو الفضل متخلص علامی نواب سلطنت اکبر شاہی در ایام مسرت پیام و ہنگام فصول بہار انجام شہر شوال تاریخ ہفتمی یوم الثالث راقم آثم عبد القادر در مولد قصبہ ایچا نگر از بلدات بلدۂ تلنگ در زمانہ حکومت و ایالت مہاراج ایچی رام خلف الرشید نارائن بابو مرحوم۔۔۔ وقت چاشت۔ این کتاب فخر ادیان اختتام و انتظام یافت ۱۲۸۹ سنہ ہجری" ترقیمہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ کاتب نے جس مسودے سے اسے نقل کیا اس پر بھی ابو الفضل کا ہی نام تھا۔

ڈاکٹر صوفی کا یہ کہنا درست نہیں کہ دبستان مذاہب ۱۰۵۵ھ ہجری مطابق ۱۶۴۵ء میں سرینگر میں اختتام پذیر ہوئی تھی۔ ہماری رائے میں کتاب میں ۱۰۵۷ ہجری مطابق ۱۶۴۷ء تک کے واقعات درج ہیں۔ ایک واقعہ سورت میں اور دوسرا حیدر آباد میں ۱۰۵۷ھ میں لکھا گیا۔ ایک میں فرانسیسی پادری کا ذکر ہے اور دوسرے میں ملا شاہ کی کرامات کا بیان ہے۔

(۱) " از ترسا تینے چند فاضل دیدہ شارہ انارہ۔ پادرے فرانسائی کہ مردم پرتگال و گووہ کمھ ہند و بندر سورت اند۔ اورا گرامی می دارند و ہزار و پنجاہ و ہفت ہجری (۱۰۵۷ھ) در بندر سورت نامہ نگار او را دریافت"[۱]

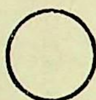
(۲) " جہاں آرا بیگم بنت شاہ جہاں بادشاہ غازی غائبانہ بفرمان ملا شاہ کبضور دل رو بہ سلوک آوردہ و کامیاب شناخت تام گشت۔ یکے از کرامات آنحضرت رفیع مرتبت کہ نامہ نگار دید آنست کہ در ہزار و پنجاہ و ہفت ہجری (۱۰۵۷) در حیدر آباد در خانۂ عزیزے وارد شد یکے از حصار بطریق سرزنش کیفیت آسیبی کہ از آتش بہ بیگم صاحبہ رسیدہ بود نپرسیدن گرفت و کردار گزار با ؤ گفت" (صفحہ ۲۱۴)

راقم الحروف نے دبستان مذاہب قلمی اور مطبوعہ نسخہ مطبع نولکشور ۱۸۸۱ء کا لفظاً لفظاً مطالعہ کیا۔ کتاب میں کوئی شہادت ایسی نہیں ملتی ہے جس کی بنا پر یہ کہا جا سکے کہ کتاب محسن فانی کی تصنیف ہے۔ مصنف کتاب کشمیر بھی آیا تھا۔ اس نے ۱۰۴۹ سنہ ہجری میں کشمیر کے کچھ واقعات بھی لکھے ہیں۔ قصہ کوتاہ میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ دبستان مذاہب ملا محسن فانی کی تصنیف نہیں ہے۔ ــــ ٥

[۱] (دبستان مذاہب قلمی ص ۳۲۷)

II

فضا ابن فیضی



بدنام ہوئی مفت ہوا، لے گئے آہو — شانوں پہ، وہ خوشبو کی ردا لے گئے آہو

گھر چھوڑ کے اب دشت میں بھٹکیں گے مرے خواب — کیا چیز تھی، پلکوں میں چھپا لے گئے آہو

آوارگی اب ٹھہری، مرے پاؤں کی زنجیر — اس قید سے خود کو تو چھڑا لے گئے آہو

تا حدِ نظر دھند میں لپٹا ہوا منظر — ہنستی ہوئی سب دھوپ چرا لے گئے آہو

ویران دریچوں کی طرح رہ گئے ہم سب — سب رنگِ شفق، رنگِ حنا لے گئے آہو

اب جا کے ترے گاؤں میں برسیں گے یہ بادل — آتے ہوئے موسم کی گھٹا لے گئے آہو

دیکھا، تو خود اپنا ہی بدن خون میں تر تھا — میں خوش تھا، کہ زخموں کی قبا لے گئے آہو

تھی شہر میں رسوا، ترے صحرا کی یہ تہذیب — اچھا ہے، مجھے ساتھ لگا لے گئے آہو

موجِ رمِ آہو ہے سرابوں کا تماشا — دریا کو بھی صحرا میں بہا لے گئے آہو

ہونٹوں کی جگہ جیسے کہ چہرے پہ یوں آنکھیں — ہماری ہوسِ حرف صدا لے گئے آہو

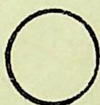
سرمایہ معانی کا ہے الفاظ کی میراث — میں نافۂ آہو تھا، اٹھا لے گئے آہو

یوں سہل نہ تھا، حجرۂ دانش سے نکلنا — دیکھی مری وحشت، تو بلا لے گئے آہو

پھرتے ہیں مہاجر کی طرح شہر میں ترے — ہم لوگ ہیں رمنوں سے نکالے گئے آہو

بس مشکِ قلم کے ہیں نگہدار فضاؔ ہم
کیا اس سے ہمیں واسطہ، کیا لے گئے ہوا

فضا ابنِ فیضی



تو بھی اک لفظ، آشوبِ معانی سے نکل آ
کیوں جزیرے سا ہے یوں محصورِ پانی سے نکل آ

یہ جو تیری ذات ہے، خود ایک پیچیدہ عمل ہے
کائناتِ وقت کی ریشہ دوانی سے نکل آ

جلتے انگاروں سے لاعلمی کی ٹھنڈی ریت اچھی
آ مری بستی میں، دشتِ نکتہ دانی سے نکل آ

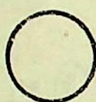
دیکھنا! منہ سے جو نکلی بات، دنیا لے اڑے گی
ہو اگر ممکن، حصارِ خوش بیانی سے نکل آ

تیری ہی موجیں ہیں، تیرے پاؤں کی زنجیر کب سے
تو جو دریا ہے، تو زندانِ روانی سے نکل آ

تجربہ ہے تو، بزعمِ خود اچھوتا سا، نیا سا
میں تو جب جانوں، روایت کی کہانی سے نکل آ

بے نفس جی، کیا ضروری ہے صبا کی پیروی بھی
یہ جھمیلے چھوڑ، فکرِ گل فشانی سے نکل آ

اے فضاؔ ڈھونڈ اور کوئی مملکت فنِ غزل کی
میرؔ و غالبؔ کے حدودِ حکمرانی سے نکل آ



چاند کی صورت خلاؤں میں سفر کرتے رہو
جسم و جاں کی یہ عبادت رات بھر کرتے رہو

ان کو ورثے میں ملا ہے تیر اندازی کا فن
تم بھی آبا کی طرح سینہ سپر کرتے رہو

بجلیوں کی یورشیں سب رائیگاں ہو جائیں گی
دل ہی دل میں خواہش لعل و گہر کرتے رہو

ہاں ملو، ایک ایک کر کے کارواں رفتہ ہے
درد بنکر چپکے سے سینے میں گھر کرتے رہو

ایک مدت سے بلائے کوہ سے محفوظ ہیں
خانقاہوں میں مناجات سحر کرتے رہو

اک نہ اک دن وہ سمندر سے پلٹ کے آئیگا
تم یونہی آرائش دیوار و در کرتے رہو

خواب گاہوں میں فقط پرچھائیاں رہ جائیں گی
جنگلوں کی آگ میں راتیں بسر کرتے رہو

(ڈاکٹر) جعفر رضا

اردو اسٹیج ــــ ابتدائی نقوش

اردو اسٹیج کے ابتدائی نقوش تلاش کرنے میں ڈرامے اور اسٹیج کے واقف کاروں کی مختلف و متضاد آراء سے قاری اُلجھنوں میں گرفتار ہوتا ہے ذیل میں ان میں بعض کا ذکر کیا جاتا ہے۔

مولانا عبدالحلیم شرر لکھنوی لکھتے ہیں۔

"امانت مرحوم نے اندر سبھا سے اردو زبان میں ڈرامے کی بنیاد ڈال کر ہمارے لٹریچر پر ایسا احسان کیا ہے جو روز بروز زیادہ نمایاں ہوتا جائے گا۔ اور جوں جوں نمایاں ہوگا اپنے مقصد کے نام کو زیادہ چمکاتا رہے گا۔" ۱؎

نورالہی محمد عمر نے امانت کی اندرسبھا کو واجد علی شاہ سے منسوب کرکے ایک فرضی داستان بیان کردی۔

"ایک فرانسیسی مقرب بارگاہ نے یورپی تھیٹروں

۱؎ عبدالحلیم شرر : تقریظ دیوان فصاحت صفحہ ۹۴

کا نقشہ پیش کیا۔ یہ وقت وہ تھا کہ فرانس بلکہ عام یورپ اوپیرا کا گرویدہ ہو رہا تھا۔ ایسا ہوا کہ ہندوستانی مذاق کا اوپیرا تیار ہو۔ قرعہ فال امانت کے نام پر پڑا۔ جنہوں نے ۱۲۷۰ھ میں اس فرض کو بوجہ احسن ادا کیا۔"[1]

انہی خیالات کی روشنی میں امتیاز علی تاج نے اُردو ڈرامے کا جنم اودھ کے نواب واجد علی شاہ کے قیصر باغ کی چہار دیواری میں بیان کیا ہے۔[2] لیکن اردو ڈرامے اور اسٹیج کے معروف محقق ڈاکٹر عبد العلیم نامی ایک مختلف داستان بیان کرتے ہیں:

"۱۵۵۰ء کے قبل پرتگالی حضرت عیسیٰ کی زندگی پر بغرض فلاح عام و خاص ہندوستانی زبان میں ڈرامے دکھاتے تھے وہ اپنی مذہبی سرپرستی میں اس قدر سرمست تھے کہ یورپ کے تھیئٹروں خاص کر فرانس اور سپین میں جو اصلاحات و ایجادات ہوتی تھیں اُنہیں جلد سے جلد ہندوستانی اسٹیج پر رائج کر دیتے تھے۔"[3]

ان بیانات کی روشنی میں حسب ذیل نتائج اخذ کئے جا سکتے ہیں:-

۱- امانت کی اندر سبھا اُردو کا پہلا ڈراما ہے۔
۲- امانت نے اندر سبھا کی تصنیف واجد علی شاہ کی فرمائش پر کی۔
۳- کسی فرانسیسی کی تحریک پر اندر سبھا کی تصنیف ہوئی۔
۴- اُردو ڈرامے کی ابتداء ۱۲۷۰ھ (۱۸۵۳ء) میں ہوئی۔
۵- اردو ڈرامے کی ابتداء ۱۵۵۰ء میں ہو گئی تھی۔

---

۱ نور الٰہی محمد عمر۔ ناٹک ساگر۔ صفحہ ۵۵ ۲ کاروان۔ لاہور ۱۹۲۴ء صفحہ ۲۰ ۳ عبد العلیم نامی۔ اُردو تھیئٹر جلد اول۔ صفحہ ۱۴۳

(۶) اولین اردو ڈراما یورپی اسٹیج کی نئی ایجادات و اصلاحات کے ساتھ قایم ہوا

(۷) اردو ڈراما "اوپیرا" کے انداز میں ہوا۔

(۸) اردو ڈراما ہندوستانی روایتوں کا امین رہا اور اس میں راجا اندر اور پریوں کا ذکر کیا گیا۔

مندکرہ بالا مسائل کئی طرح کی پیچیدگیاں پیدا کرتے ہیں۔ یہاں اُنکی تفصیلی بحث کی گنجایش نہیں لیکن اتنا عرض کر دینا نامناسب نہ ہوگا کہ ان میں سے زیادہ تر بیانات وخیالات غیر صحیح ہیں یا کسی ادھوری حقیقت پر مبنی ہیں۔ پروفیسر مسعود حسن رضوی نے[1] اور سید بادشاہ حسین[2] نے نور الٰہی اور محمد عمر کے بیانات کا جائزہ لے کر انہیں غیر معتبر قرار دیا ہے اس لئے اب یہاں اعادہ کرنا غیر ضروری معلوم ہوتا ہے۔ منطقی اعتبار سے نور الٰہی محمد عمر کے بیانات کے بطلان کے بعد مولانا شرر کا خیال خود بخود ساقط الاعتبار ہو جاتا ہے ہمیں خاص طور پر ڈاکٹر نامی کے بیان پر حیرت ہے۔ کیونکہ عصر حاضر میں انہیں ڈرامے کے معتبر محقق کی حیثیت سے امتیاز حاصل ہے۔ انہوں نے ڈرامے کی ابتداء کے سلسلے میں جو داستان تصنیف فرمائی ہے۔ اس کا نہ تو کوئی ماخذ بیان کیا ہے نہ کسی طرح کے داخلی یا خارجی شواہد پیش کئے ہیں اس لئے ہمیں اُن کا بیان قبول کرنے میں تامل ہی نہیں گریز ہے۔ ڈاکٹر مسیح الزماں کا خیال صحیح ہے۔

"تاریخی معلومات سے زیادہ یہ خواب وخیال کی باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ محمد قلی قطب شاہ کی پیدائش ۱۵۶۵ء میں ہوئی تھی۔ اس سے پہلے اُردو ڈراموں کے رواج کا ثبوت اگر واقعی مل جائے تو اُردو ادب کی تاریخ میں گراں قدر اضافہ ہو جائے گا۔

---

(۱) سید مسعود حسن رضوی۔ لکھنؤ کا شاہی اسٹیج (۲) سید بادشاہ حسین۔ اُردو ڈراما۔

مگر ابھی تک اس خیال کی تائید نہیں ہو سکی۔"[1]

اب تک کی تمام تحقیقات میں پروفیسر سید مسعود حسن رضوی کا بیان زیادہ قرین قیاس اور صحیح معلوم ہوتا ہے۔ انھوں نے اُردو ڈرامے کے ابتدائی نقوش بادشاہِ اودھ نصر الدین حیدر کے دور سے بیان کئے ہیں جن کے عہد میں بعض ایسے کھیل اور جلسے ہوئے جن میں ڈرامائی عناصر نظر آتے ہیں[2]۔ اسی دور کے مصنف رجب علی بیگ سرور کا بیان ملاحظہ ہو:

"کسی نے راگ مالے کی کتاب نذر گزرانی فرمایا، اس کا جلسہ ہو۔ جو راگنی جس صورت و پوشاک سے دیکھی وہی صحبت ٹھہری۔ ایک بھیروین کے جلسے میں پان نے عورت دولہن کا لباس پہنے ہاتھوں پاؤں میں مہندی لگی پوڑی شہانی سر سے پا تک جواہر کا زیور۔ ایک راگنی کی صحبت تیس دن ہوتی تھی اندر کی سبھا آبرو کھوتی تھی۔"[3]

اندر کی سبھا کا استعارہ بعضوں کو امانت کی 'اندر سبھا' تک لے گیا جس کا ذکر متذکرہ بالا سطروں میں آچکا ہے۔ حالانکہ سرور نے اپنے مخصوص اسلوب میں راگ مالا کے جلسوں میں حرکت و عمل کے ڈرامائی پہلو نمایاں کئے ہیں۔ نصر الدین حیدر کو ان جلسوں سے بڑی دلچسپی تھی۔ انھوں نے رقص و سرود کے لئے کثیر تعداد میں گانے والیاں رکھی تھیں جو جلسے والیاں کہلاتی تھیں اس رجحان کو واجد علی شاہ کے زمانہ ولیعہدی میں خصوصی فروغ ملا۔ واجد علی شاہ نے خوش گلو اور حسین و جمیل عورتیں تلاش کرکے اکٹھا کیں۔ اور ان کی تعلیم و تربیت

---

[1] ڈاکٹر مسیح الزماں خورشید دیباچہ [2] سید مسعود حسن رضوی۔ لکھنؤ کا شاہی اسٹیج صفحہ ۶۰ [3] رجب علی بیگ سرور۔ فسانہ عبرت۔ صفحہ ۱۰۸

کے لیئے ماہرینِ موسیقی ملازم رکھے۔ انہیں جس مکان میں رکھا گیا اُسے 'پری خانہ' کا نام دیا۔ اسی 'پری خانہ' یا واجد علی شاہ کے یومِ ولادت پر جوگی بننے کی رسم سے اردو اسٹیج کی ابتدائی شکل تیار ہوتی ہے۔ واجد علی شاہ نے کرشن جی کی لیلاؤں اور رہس کی بنیاد پر رہس لکھے اور اپنے تنوع پسند مزاج کے اعتبار سے ایجاد و اختراع سے کام لیا۔ واجد علی شاہ نے 'بنی' کے چوتھے باب میں "رہس کے بیان" کی جو فصلیں پیش کی ہیں، ان میں ایک میں اپنے چھتیس رہسوں کا ذکر ہے۔ اور دوسرے میں رادھا کنھیا کے دو مختلف قصوں کا بیان ہے۔ رادھا کنھیا کے انہی قصوں کو پروفیسر سید مسعود حسن رضوی اور ڈاکٹر صفدر آہ نے شاہی رہس کے اولین جلسے کی حیثیت سے قبول کیا جسے ڈاکٹر عشرت رحمانی نے بھی اُردو ڈرامے کا پہلا نقش قرار دیا ہے[1] ڈاکٹر رحمانی نے ان رہسوں کا زمانہ تصنیف ۱۲۷۸ھ قرار دیا ہے[2]۔ یہ رہس پہلی بار شاہی محل کے قیصر باغ کی حدود میں حضور باغ میں کھیلے گئے۔ اس کی تائید واجد علی شاہ کی اپنی تحریروں سے بھی ہوتی ہے۔ پروفیسر سید مسعود حسن رضوی نے مختلف دلائل پیش کئے ہیں۔ اس کی سرپرستی ابتدا میں انگریزوں نے کی۔ کلکتہ کے بعد ان کی سب سے بڑی چھاؤنی بمبئی میں تھی۔ وہ اپنی تفریحِ طبع کے لئے کبھی چھاؤنیوں میں اپنے رہائشی مکانوں میں اور مخصوص نشستوں میں ڈرامے کرتے تھے جو انگریزی کی بجا ہوتے تھے۔ ان کے اداکار فوج کے جوان ہوتے جب ایک رجمنٹ تبدیل ہو جاتی تو دوسری اس کی جگہ آجاتی یہ لوگ اردو ڈرامے کی تاریخ میں Bombay Theatre کے نام سے یاد کئے جاتے تھے۔ ان ڈراموں کی ابتداء بمبئی امیچر تھیٹر سے ۱۷۵۰ء سے ثابت

۱، ۲ عشرت رحمانی: اُردو ڈرامے کا ارتقاء، صفحہ ۷۳، ۸۳۰

ہے۔ ڈاکٹر نامی سے کے نزدیک بمبئی تھیئٹر کا قیام ۱۷۷۰ء میں ہوا۔ اور اس کا پہلا تماشا Haunted Drummer House ہے۔ یہ تھیئٹر وقت کے ساتھ مختلف دشواریوں کا سامنا کرتا رہا۔ لیکن تھیئٹر ہال باقی رہا۔ جو کبھی نیلام گھر بنا ہمیشہ خسارے میں چلتا رہا۔ اس کی مجلس منتظمہ بار بار تبدیل کی جاتی تھی۔ ہر بار قرض کے بوجھ میں اضافہ ہوتا تھا۔ نتیجہ میں ۱۸۳۵ء میں مسٹر ٹموتھی ہم نے حکومت کی اجازت سے اسے پانچ لاکھ اکیس ہزار ایک سو تیس روپیوں میں نیلام کر دیا۔ اور اس کی رقم شاہی خزانے میں داخل کر دی۔ طویل خاموشی کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی کی مدد سے جگن ناتھ شنکر سیٹھ نے ۱۸۴۵ء میں تھیئٹر ہال تعمیر کیا جس میں ۱۸۴۶ء سے انگریزی ڈراموں کے دکھانے کا سلسلہ شروع ہوا۔ مدنظر رہے کہ جگن ناتھ شنکر سیٹھ نہ صرف یہ کہ دولت مند ہندوستانی رئیس تھے بلکہ انہیں فنون لطیفہ سے خصوصی دلچسپی تھی۔ اُنہی کی کوششوں سے انگریزی کے ساتھ ساتھ ہندوستانی ڈرامے بھی اسٹیج کیے گئے۔ ہندوستانی ڈرامے ہندو ڈرامہ کمپنی کو رنے تیار کیے۔

ہندوستانی ڈراموں کی پیشکش کی کامیابی کی بناء پر پارسی سرمایہ داروں کو تھیئٹر سے دلچسپی پیدا ہوئی۔ اور متعدد تھیئٹر کمپنیاں قائم ہوئیں۔ سب سے پہلے ۱۸۵۳ء میں فرام جی گستار جی دلال کی مساعی سے پارسی ناٹک منڈلی قائم ہوئی۔ لیکن یہ زیادہ دنوں تک قائم نہ رہ سکی اس کے بعد انہوں نے ایک دوسری تھیئٹر کمپنی ۱۸۵۹ء میں قائم کی تھی۔ اس کے بعد متعدد ڈراما کمپنیاں وجود میں آئیں۔ جو تھوڑے تھوڑے عرصے تک اپنا جلوہ دکھا کر نابود ہو گئیں۔ ڈاکٹر میمونہ دلوی نے اپنے تحقیقی مقالے میں ان کمپنیوں کی تفصیل درج کی ہے۔ یہاں ان کا اعادہ غیر ضروری معلوم ہوتا ہے مدنظر رہے کہ اس دور میں متعدد ناٹک منڈلیاں ضرور قائم تھیں لیکن

ان کے اسٹیج کرنے کے لئے تھیٹر ہال بہت کم تھے۔ ۱۸۶۱ء میں الفنسٹن کالج کے
پارسی طالب علموں نے الفنسٹن ڈرامٹک کلب قائم کیا۔ جس کے روح رواں
کیخسرو جی سہراب جی ناظر تھے۔ انہوں نے کئی ڈرامے لکھے ہیں۔ جن میں اندر سبھا،
کوپی کھیل، پاک دامن اور سلیمانی شمشیر زیادہ مشہور ہیں۔ انہیں اپنے دور میں
بے پناہ مقبولیت حاصل ہوئی۔ جس کے نتیجہ میں انہیں ۱۸۷۶ء کے دلی دربار
میں شرکت کی دعوت دی گئی۔ جس میں انہوں نے شرکت کی۔ وکٹوریہ ناٹک منڈلی
کے ساتھ دلی گئے۔ انہوں نے اپنے بعد الفنسٹن کی نگرانی دادا بھائی رتن جی
ٹھونٹی کو سپرد کردی۔ جس میں شیکسپیئر کے بعض ڈرامے پیش کیے گئے۔ ان
ڈراموں میں مرچنٹ آف وینس اور اوتھیلو وغیرہ کو زیادہ مقبولیت حاصل
ہوئی۔ اس کے بعد ۱۸۶۶ء میں اوریجنل الفنسٹن کلب قائم ہوا۔ پارسیوں نے
پہلے گجراتی ڈراموں کے لئے گرنتھ شالا ایک منڈلی قائم کی۔ بعد میں اسی کا
نام وکٹوریہ ناٹک منڈلی پڑا۔ اس کا قیام ۱۸۶۸ء میں ہوا۔ اس کلب کے روح رواں
کاوس جی تھے۔ انہوں نے ڈرامے میں جدت پیدا کرنے کے لئے ایرانی تمثیلوں کو
اپنا ماخذ قرار دیا۔ جس سے متاثر ہو کر پرشین ناٹک منڈلی کی بنیاد پڑی۔ اس
کے بانی دادا بھائی سہراب جی پٹیل تھے۔ اس منڈلی نے کئی اہم ڈرامے اسٹیج
کئے۔ اس کے اداکار ایرانی تھے جو اپنے روپ رنگ میں عام ہندوستانیوں
سے بہتر تھے۔ اس منڈلی کے زیر اہتمام "رستم و سہراب" اور رستم
خداسی میں اسٹیج کیا گیا۔ اس کے بعد پارسیوں نے ڈرامے میں اور بھی دلچسپیاں
لیں۔ اور اردو ڈرامے کے فروغ میں ذاتی دلچسپی کا اظہار کیا۔ لیکن ان کا مقصد
اردو زبان و ادب کی ترویج سے زیادہ مالی منفعت تھا۔ وہ ایک زبان میں
ڈرامے پیش کرنا چاہتے تھے جس کو زیادہ سے زیادہ لوگ دیکھیں اور سمجھ سکیں
اسی مقصد کے پیش نظر گجراتی زبان کے ڈرامانگار ایدل جی جمشید جی کھوری

نے "سونا نہی خورشید" ڈراما اردو میں لکھا لیکن اردو رسم الخط سے ناواقف ہونے کی بناء پر انہوں نے گجراتی رسم الخط میں لکھا اور ۱۸۷۱ء میں پیش کیا گیا مدنظر رہے کہ دلی دربار کے اعلان نے کئی دوسرے ڈراما نگاروں کو بھی متوجہ کیا جن میں دادی پٹیل کے دل میں بھی اُمنگ پیدا ہوئی۔ اور وہ بھی دلی دربار میں شرکت کے لئے گئے۔ لیکن ناظر اپنے مقصد میں زیادہ کامیاب نہ ہوئے اور ۱۸۸۳ء میں انہیں اپنی ناٹک منڈلی اپنے اداکاروں کے حوالے کردینا پڑی۔ ان کے بعد ان کے ہدایت کار دادا بھائی ٹھونٹی اور منتظم خورشید بالی والا ہوئے۔ بعد میں دونوں میں اختلاف ہوا۔ اور ٹھونٹی کمپنی سے الگ ہوگئے۔ بالی والے نے منیجر اور ڈائرکٹر بننے کے بعد کلکتہ، رنگون اور مانڈلے کا سفر کیا۔ اور متعدد ڈرامے پیش کئے۔ جس سے انہیں بے پناہ دولت ملی اس رنگ میں ۱۸۸۵ء میں وہ ایک بین الاقوامی نمائش میں حصہ لینے کیلئے لندن گئے۔ لیکن اس بار قسمت نے پانسہ پلٹ دیا اور انہیں زبردست خسارے کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کے بعد پارسی تھیئٹر کی سرگرمیاں ختم ہوگئیں۔ اب دوسری تھیئٹر کمپنیوں کا زمانہ آیا۔



شہپر رسول



زہرِ شب، ویران بستر اے خدا
کرب اک منظر بہ منظر اے خدا

میں ترے شاہیں کا شہپر اے خدا
کون ہے میرے برابر اے خدا

خواہشِ پرواز پر ہنستا ہوا
طائرِ مجبور و بے پر اے خدا

گھر کے گر جانے کا تجھ سے کیا گلہ
بارشیں ہوتی ہیں اکثر اے خدا

دوستی اور دشمنی کے نام سے
قید ہوں کس کس کے اندر اے خدا

کاش! تو بھی مجھ میں آ کر دیکھتا
ڈوبتے سورج کا منظر اے خدا

زیرکچھ "بونے" مجھے کیسے کریں
بیوقوفوں کی مدد کر اے خدا

میرا ہمسایہ بھی مجھ سا کیوں نہیں
یہ تعصب ہے سراسر اے خدا

شہپر رسول



کیسے رُک پائیگا یہ سبز لہو دیکھ تو لیں
دِل کے زخموں پہ بھی ہوتا ہے رفو دیکھ تو لیں

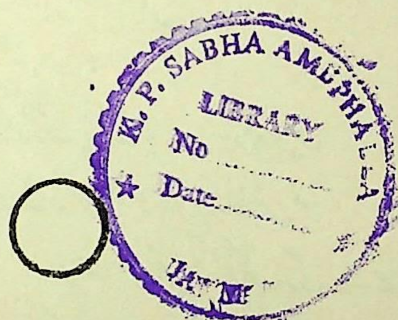
کونسا باب کہانی کا کھُلا رکھنا ہے
کونسی سمت سے دَر آئیگا تو دیکھ تو لیں

قُرب کو خامۂ اِنکار سے لکھنے والے
آ۔ تری آنکھوں میں ہم رنگِ عدو دیکھ تو لیں

جانے وہ کونسا جذبہ تھا کہ جو کہتا تھا
لوٹ کر جلتے ہوئے شہر کی سو دیکھ تو لیں

میرا سایہ بھی وہ دیکھیں کہ نہ دیکھیں شہپر
دِل کی آنکھوں سے ذرا منظرِ ہو دیکھ تو لیں

ڈاکٹر نزیش



یہ عشق بھی کیا شے ہے اور ان کا کھونا ہے
ہر روز کا ہنسنا ہے اک عمر کا رونا ہے

پیپل سے بچھڑ کر ہم ہو بیٹھے ہیں کیکٹس کے
اب ذکرِ کبھی گاؤں کا پلکوں کا بھگونا ہے

اے تیز قدم لوگو لِللّٰہ ذرا بچ کر !
اِن کانپتے ہاتھوں میں ماضی کا کھلونا ہے

اے روحِ مقدس تو سو جائے تو بہتر ہے
مجھکو کسی ہمدم کے نشتر سا چبھونا ہے

حق گوئی نزیشؔ اس پر اس درجہ یہ بے باکی
کس دار پہ چڑھنا ہے کس دار پہ اترنا ہے

احسن شفیق

یہ شہرِ بے ثبات ہے پوچھو گے کس جگہ

رُک کر کسی مقام پر اس شخص کا پتہ

ہر حُسن کھو چکا ہے سرِ راہ زندگی

آؤ چلیں یہاں سے یہاں کچھ نہیں رہا

دعویٰ بہت قریبِ رگِ جاں کا ہے تجھے

پھر کیوں ہے دل کے بیچ یہ صدیوں کا فاصلہ

آنکھوں کے پار جھیلِ تمنا میں روز و شب

ہر لمحہ ڈوبتی ہے کسی خواب کی صدا



آحسن شفیعی

میرے اَن دیکھے سفر کا پیش منظر کچھ نہ تھا
دھند کی اک ریت تھی ساحل سمندر کچھ نہ تھا

اک صدا دستِ طلب کیوں مستقل باہر کھڑی
اس مکاں کے سامنے تھی جس کے اندر کچھ نہ تھا

زرد کائی تھی جمی محرومیوں کی ہر طرف
خواہشوں کے شہر کی دیوار و در پر کچھ نہ تھا

کوئی آہٹ، کوئی دستک نہ کہیں سرگوشیاں
منجمد اس گھر کے اندر اور باہر کچھ نہ تھا

از زمیں تا آسماں چاروں طرف تھا بس دھواں
آرزوئے شہر کی آنکھوں میں منظر کچھ نہ تھا



II

مرزا محمد زمان آزردہ

مرزا دبیر کی اردو نثر اور فصیح کی نخلِ ماتم

مرزا دبیر عام طور پر ایک مرثیہ گو کی حیثیت سے مشہور ہیں۔ جس طرح بیشتر لوگ اُن کی غزل گوئی، مثنوی نگاری، قصیدہ گوئی سے ناواقف ہیں اسی طرح بہت کم لوگ اُن کی نثر نگاری کا علم رکھتے ہیں۔ فارسی نثر تو خیر اُن کی چھپی نہیں بلکہ ہنوز مخطوطات کی شکل میں موجود ہے[۱]۔ لیکن اردو میں اُن کی ایک باقاعدہ نثری تصنیف ملتی ہے جو ابواب المصائب کے نام سے مطبع یوسفی دہلی سے شائع ہوئی تھی۔ صاحب حیات دبیر اس کے بارے میں تحریر کرتے ہیں :

"ایک اردو نثر کی کتاب مصائب میں مطبع یوسفی دہلی میں چھپی ہے جس کا نام "ابواب المصائب" ہے۔ جناب مرزا اوج صاحب قبلہ سے بر سبیل تذکرہ معلوم ہوا کہ اس کا اصل مسودہ مرزا صاحب کے کتب خانہ میں موجود ہے۔ پس یہ کتاب بالتحقیق انہیں کی تصنیف پائی جاتی ہے۔ میرے کرم فرما سید صغیر حسین صاحب شمسی مالک مطبع یوسفی دہلی و منیجر اخبار اثنا عشری دہلی کی شعاع توجہ و مہربانی سے یہ کتاب مجھے ملی۔ دیباچہ سے معلوم ہوتا ہے کہ نصیر الدین حیدر بادشاہ دوم اودھ کے عہد میں یہ کتاب مرزا صاحب نے کہی (لکھی) حضرت یوسف کے واقعات جا بجا لکھ کر حالات امام حسین کا پیوند لگایا ہے۔ باوصفیکہ اب سے پچاس سال پہلے کی تصنیف ہے مگر زبان سلیس ہے۔ عبارت میں اس زمانہ کی روش کے

---

[۱] ملاحظہ ہو راقم کا مضمون مرزا دبیر کی نثر نگاری — نثر فارسی مطبوعہ شیرازہ جلد ۹ شمارہ ۵

موافق فارسی و عربی کے الفاظ بہت ہیں۔ مگر عبارت کو خواہ مخواہ مقفےٰ نہیں بنایا ہے۔ اس لئے دلچسپی سے خالی نہیں"۔[1]

ثابت کے بعد اس کتاب کا تذکرہ ذاکر حسین فاروقی نے اپنی کتاب دبستانِ دبیر میں اس طرح کیا ہے۔ "انہوں نے [مرزا دبیر نے] نثر میں ابواب المصائب کے نام سے ذاکری کی ایک کتاب تصنیف کی تاکہ جو فریضہ وہ نظم میں مدت العمر ادا کرتے رہے اسے نثر میں بھی ادا کر دیں۔ یہ کتاب مرزا صاحب نے عہد شاہ نصیر الدین حیدر میں تصنیف کی تھی اور اس کی تاریخ بھی خود ہی نکالی تھی۔ "مصحف طاق چشم اہل عزا ست" (سنہ ۱۲۴۵ھ)۔ یہ کتاب ۱۶۸ صفحات پر شائع ہوئی ہے۔ اور اردو نثر کی ابتدائی کتابوں میں شمار کی جا سکتی ہے۔ یہ کتاب ذاکری کے اس طریقہ سے تعلق رکھتی ہے جسے "نثر خوانی" کہا جاتا ہے اس لئے کہ اس میں اشعار بھی چسپاں کئے گئے ہیں جو نثر خوانی کا دستور ہے۔ کتاب کی زبان عالمانہ اور رواں ہے۔ ادبیت کی چاشنی کافی ہے اور جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ یہ اس عہد کی تصنیف ہے۔ جس عہد میں فسانۂ عجائب لکھی گئی تھی تو اس بات کی داد دینا پڑتی ہے۔ کہ مرزا صاحب نے صاف اور شستہ زبان استعمال کر کے اس زمانہ کے عام رنگ کے برخلاف نثر میں بھی اپنی ایجاد پسندی کا سکہ قائم رکھا۔ ابواب المصائب سورۂ یوسف کی تفسیر ہے جس میں جگہ جگہ ربط مصائب دے کر اسے رقت آفریں بنا دیا گیا ہے"۔[2]

ثابت اور فاروقی کے ان بیانات سے اس تصنیف کی فنی اہمیت کا اندازہ نہیں ہوتا۔ اب یہ تصنیف تقریباً نایاب[3] ہو چکی ہے۔ البتہ ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی نے اپنے مضمون بعنوان "ابواب المصائب" (مطبوعہ کاروانِ حیات بمبئی شہید اعظم نمبر) میں اس پر قدرے تفصیل سے بحث کی ہے اور اس کی

---

[1]: حیات دبیر جلد اوّل ص۲۲۹-۲۳۰

[2]: دبستان دبیر ص۱۶۴-۱۶۵۔ [3] راقم نے اس کتاب کے سلسلے میں ایک مرتبہ اشتہار شائع کرایا تھا کہ اگر کسی کو اس کے بارے میں کوئی علم ہو یا کسی کے پاس یہ کتاب موجود ہو تو اطلاع دی جائے مگر اس وقت یہ کتاب دستیاب نہ ہوئی اور تین سال بعد راقم کو اس کا ایک نسخہ جناب محمد رشید صاحب کے ذاتی کتب خانہ واقع لکھنؤ میں ملا ہے۔ جس سے ڈاکٹر اکبر حیدری بھی استفادہ کر چکے ہیں۔

بعض خصوصیات کو منظر عام پر لایا ہے۔ جو یہ ہیں[1]:

(۱) جس وقت ابواب المصائب لکھی گئی اس وقت تک کوئی شیعہ عالم اردو میں کتاب نہیں لکھتا تھا بلکہ وہ اردو میں تصنیف و تالیف کا کام کرنا کسر شان سمجھتے تھے۔ مرزا دبیر نے اردو میں ایک مذہبی تصنیف پیش کر کے ایک بڑی علمی جرأت کا مظاہرہ کیا۔

(۲) ابواب المصائب میں جو انداز ذاکری سامنے آتا ہے وہ "حدیث خوانی" اور "نثر خوانی" کا مرکب کہا جا سکتا ہے۔

(۳) ابواب المصائب اردو کے تفسیری ادب کی اہم کاوش ہے۔

(۴) غالب نے ۱۸۵۰ء (مطابق ۱۲۶۷ھ) کے بعد خط اردو میں لکھنا شروع کیا جس کی وجہ سے انہیں آسان اور سلیس زبان اردو کے استعمال کے لئے ترجیح دی جاتی ہے۔ جب کہ مرزا دبیر کی باقاعدہ تصنیف ابواب المصائب مرزا غالب کی اس کاوش سے قبل یعنی ۱۲۴۵ھ ہی میں منصۂ شہود پر آ چکی تھی۔

ڈاکٹر اکبر حیدری نے بھی مرزا دبیر کی اس تصنیف پر قدرے تفصیل سے بحث کی ہے۔ اس کا دیباچہ اور آخر میں دیا ہوا قطعہ تاریخ بھی نقل کیا ہے۔ وہ تحریر کرتے ہیں:

"مرزا دبیر کو نظم کی طرح نثر میں بھی یکساں قدرت حاصل تھی۔ راقم الحروف کو ان کی ایک نثری تصنیف موسوم بہ ابواب المصائب دستیاب ہوئی۔ یہ کتاب نایاب ہے اور اب عنقا کا حکم رکھتی ہے۔[2]"

ڈاکٹر حیدری اسے دبستان لکھنؤ کی دوسری نثری تصنیف قرار دیتے ہیں۔

"ابواب المصائب رجب علی بیگ سرور کے فسانۂ عجائب کے بعد دبستان لکھنؤ کی دوسری نثری تصنیف ہے۔ یہ عہد نصیر الدین حیدر بادشاہ میں ۱۲۴۵ ہجری میں تصنیف کی گئی۔ اس کی زبان سادہ

---

[1]: ملاحظہ ہو مضمون "ابواب المصائب" مصنفہ ذاکر حسین فاروقی مطبوعہ کاروان حیات بمبئی۔ شہید اعظم نمبر محرم ۱۳۹۱ھ ص ۹۳-۹۶

[2]: شاعر اعظم ص ۱۶۰

سہل ہے اور اس میں فسانۂ عجائب جیسی پر تکلف مقفّٰی اور مسجع عبارت نہیں ہے[1]۔

اس کے بعد موصوف نے اس کا دیباچہ وغیرہ نقل کیا ہے مگر کوئی مفصل بحث نہیں کی ہے جس سے اس کی خصوصیات سامنے آتیں یا دلبستان لکھنؤ کے نثری کارناموں میں اس کا مرتبہ متعین ہوتا۔

دلبستان لکھنؤ میں اس قسم کی دو کتابیں ملتی ہیں۔ ایک مرزا جعفر علی خاں فصیح کی "نخل ماتم" اور دوسری مرزا دبیر کی "ابواب المصائب"۔ مفہوم اور مقصد کے لحاظ سے دونوں کتابوں کا موضوع ایک ہے۔ دونوں کی اردو میں البتہ انداز بیان دونوں کا اس قدر مختلف ہے کہ ایسا معلوم ہوتا ہے اگر فصیح کی کتاب "نخل ماتم" مرزا دبیر کی "ابواب المصائب" سے پہلے تصنیف ہوئی ہوگی تو مرزا دبیر نے یا تو اس کو دیکھا نہیں تھا یا اس سے بچ کر اپنی کتاب تصنیف کی۔

ڈاکٹر حیدری نے اپنے مضمون "مرزا جعفر علی فصیح"[2] میں "نخل ماتم" کا ذکر کرتے ہوئے اس کے تین قلمی نسخوں کی نشاندہی کی ہے جن میں سے ایک کتب خانہ آصفیہ میں ہے جس کے آخر میں یہ ترقیمہ دیا ہوا ہے۔

"تمام ہوا یہ نسخہ مسمّٰی نخل ماتم تصنیف حاجی مرزا جعفر علی فصیح ؎

ہر کہ خواند دعا طمع دارم زانکہ من بندہ گنہگارم

کاتب الحروف ایں جلد معظم مظفر علی خان پسر مصطفےٰ علی نیزہ بردار شاہ سوار جنگ بہادر طالب الدولہ در ماہ شعبان المعظم در سنہ ۱۲۸۴ھ مقدسہ ۱۲۶۸ھ بفضلی زیب تحریر یافت[3]"

دو اور نسخے رام پور کے کتب خانہ میں ہیں جن میں سے ایک کی کتابت ۲۶ ربیع الاول سنہ ۱۲۸۱ھ کو ہوئی ہے اور دوسرے نسخے کی تاریخ کتابت کا ذکر ڈاکٹر حیدری نے نہیں کیا ہے[3]۔

---

[1] شاعر اعظم ص ۱۶۰

[2] یہ مضمون ان کے مجموعۂ مضامین تحقیقی نوادر میں شامل ہے۔

[3] تحقیقی نوادر ص ۳۱۲۔

راقم الحروف کو اس کے دو مطبوعہ نسخے ملے جو محمد رشید (لکھنؤ) کے ذاتی کتب خانہ میں موجود ہیں دو نسخے ڈاکٹر سید شبیہہ الحسن (لکھنؤ) کے نجی کتب خانہ میں دستیاب ہوئے۔ ان میں سے ایک جس پر تقدم کا گمان غالب ہوتا ہے، سنہ ۱۲۶۲ھ میں مرزا جعفر علی کربلائی نے مطبع حیدری لکھنؤ سے شائع کرایا ہے۔ دوسرا مطبع جعفری نخاس جدید لکھنؤ سے شائع ہوا ہے۔ اس پر سنہ اشاعت نہیں دیا ہے۔ جن مطبوعہ یا غیر مطبوعہ نسخوں کا اوپر ذکر کیا گیا ان سے یہ بات کسی طرح صاف نہیں ہوتی کہ "نخل ماتم" کا سنِ تصنیف کیا ہے۔ ڈاکٹر اکبر حیدری بھی اس ضمن میں خاموش ہیں۔ موصوف ابواب المصائب تصنیف مرزا دبیر کو دلستان لکھنؤ کی دوسری نثری تصنیف قرار دیتے ہیں۔ اور پہلی نثری تصنیف ان کے نزدیک فسانہ عجائب ہے[1]۔ اس کا یہ مطلب لیا جائے گا کہ "نخل ماتم" "ابواب المصائب" کے بعد تصنیف ہوئی جو قرینِ قیاس معلوم نہیں ہوتا اور اس سلسلے میں شواہد کی غیر موجودگی میں کوئی فیصلہ صادر کرنا گمراہی کا باعث ہو سکتا ہے۔

سید سبط محمد نقوی اپنے ایک مضمون مرزا فصیح کی نثری تصنیف "نخل ماتم" میں اس کے سنِ تصنیف کے بارے میں لکھتے ہیں:

"فصیح کے سفر زیارت کا سال سنہ ۱۲۲۷ھ ہوتا ہے۔ اور دوسرے سفر کی آرزو کم سے کم سولہ سال یعنی "نخل ماتم" کی تصنیف کے وقت تک نہیں ہوئی۔ لہٰذا اسے کم و بیش سنہ ۱۲۴۳ھ ہونا چاہیے۔ اس طرح نخل ماتم بہ اعتبار زمانی ابواب المصائب سے کم و بیش دو سال مقدم ٹھہرتی ہے۔ اور اسے دلستان لکھنؤ کی نثر نگاری میں ابواب المصائب سے سابق قرار دینا چاہیے[2]"

انہوں نے جس بنیاد پر یہ مفروضہ قائم کیا ہے۔ اس میں شک کی کافی گنجائش ہے کیونکہ "نخل ماتم

---

[1] : شعر اعظم ص ۱۶۰

[2] مرزا فصیح کی نثری تصنیف "نخل ماتم" ص ۲ مطبوعہ ہماری زبان دہلی اس مضمون کا اصل مسودہ راقم کو محمد رشید صاحب لکھنؤی کے کتب خانہ میں ملا ہے اور راقم نے اسی سے استفادہ کیا ہے چنانچہ صفحہ نمبر کا حوالہ بھی اسی مسودہ سے دیا گیا ہے۔

؛ مطبع حیدری) مطبوعہ ۱۲۶۲ھ کے صفحہ ۱ پر مرتب نے تحریر کیا ہے۔

"یہ نسخہ نخل ماتم تصنیف افصح الفصحا و افضل الشعرا مرزا جعفر علی فصیح دام ظلہ کہ بارہ رطب پر مرتب تھا۔ احقر نے چودہ رطب ترتیب دیا اور بعض رباعیات و احوال متفرقات مختصرات سے حاشیہ کتاب کو مزین کرکے جعفر علی کربلائی نے مطبع حیدری میں چھپوایا۔ . . . . بفضلہ تعالیٰ و حسن توفیقہ بتاریخ نہم شہر ذلحجہ الحرام ۱۲۶۲ھ در کاب گنج جدید بحسن سعی کارپردازان مطبع حیدری سید محمد الزمان صفوی پرانہ اختتام پوشید۔"[1]

اس مطبوعہ نسخہ کے صفحہ ۱۶۱ کے حاشیہ پر "تمت تمام شد" کے بعد یہ عبارت درج ہے۔

"در شہر ذیقعد ۱۲۶۲ ہجری مطبع حیدری جناب فیض ماب مسیح الزماں ارسطو دوراں حکیم سید محمد زماں صاحب دام ظلہ العالی بتوفیق ایزدی بارادت و سعی مرزا جعفر علی صاحب کربلائی حلیہ طبع پوشید"[2]۔

سن تصنیف کی بنیاد جن اشعار پر رکھی گئی ہے وہ دوسرے مطبوعہ نسخہ میں چودھویں رطب کے بعد درج ہیں۔ یہ دراصل پندرہ اشعار پر مشتمل دعائیہ ہے جس کا پہلا شعر ہے۔

عزاداروں پہ ہنگام بکا ہے — دلے ہر درد و غم کی انتہا ہے

اور آخری تین شعر، جن سے سن تصنیف کے بارے میں سید سبط محمد نقوی نے رائے قائم کر لی ہے یہ ہیں۔

فصیح ناتواں کو بار الہٰا — دوبارہ آرزو ہے بادشاہا

ہے اس امید میں سولہ برس سے — نہ باز آویگا ہرگز اس ہوس سے

مشرف کر اسے بھی نیم جاں ہے — حسین ابن علی کا مدح خواں ہے[3]

---

[1]: نخل ماتم مطبوعہ مطبع حیدری ص ۱

[2]: نخل ماتم مطبوعہ مطبع حیدری ص ۱۶۱ ؛ [3]: نخل ماتم مطبوعہ مطبع جعفری تحاس جدید لکھنؤ ۱۲۶۶ھ ص ۱۶۱

اس میں چونکہ اصلی رطب صرف بارہ ہیں اور مرتب نے اضافے کئے ہیں اس لئے یہ بات بھی عین ممکن ہے کہ جس طرح اُنھوں نے حاشیوں کا اضافہ کیا، بارہ سے چودہ رطب کر دئے اسی طرح اس دُعائیہ کا بھی اضافہ کیا ہو۔ قدیم مطبوعہ نسخہ جس کا راقم نے ذکر کیا ہے اس پر بھی آخر میں "تمام شد" تحریر کیا ہوا ہے مگر گمان غالب ہے کہ وہ بھی نامکمل ہے۔ اور یہ بات قابل توجہ ہے کہ یہ دعائیہ اس میں شامل نہیں ہے دونوں نسخوں کی اس کے بعد کی عبارتیں بھی مشابہہ ہیں۔ مگر نقش اوّل (مطبوعہ ۱۲۶۲ھ) میں یہ دُعائیہ غائب ہے۔

بہرکیف یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ دونوں کتابوں یعنی "ابواب المصائب" اور "نخل ماتم" میں تقدم کس کو حاصل ہے۔

نخلِ ماتم کی تفصیل

"نخل ماتم" فضائل و مصائب اہل بیت کے بیان میں ایک نثری تصنیف ہے جس میں جگہ جگہ ربط دینے کے لئے نظم سے کام لیا گیا ہے۔ عنوان کتاب کی نسبت سے اس کے ہر باب کو مصنف نے "رطب" کا نام دیا ہے۔ اس کے متعلق ابتدا میں کہا ہے۔

نبی تو نخل ہیں زہرا ہیں شاخ گل تمیمہ حسن حسین رطب ہیں محب ہیں برگ شجر

اور پہلے رطب میں اس عنوان کی وضاحت اس طرح بھی کی ہے:

جناب رسول خدا نے یوں فرمایا ہے اَنَا الشَّجَرَۃ و فاطمۃ فرعها وعَلِیٌّ لقاحها یعنی میں ایک
درخت ہوں سرسبز اور فاطمہ زہرا اُس کی شاخ تروتازہ ہے اور علی مرتضیٰ اوس کا پھول ہے شگفتہ
والحسن والحسین ثمرتها اور میوے حسن اور حسین اوس نخل کے رطب ہیں وَشیعتنا اهل البیت اوراقها
اور شیعہ موالی اہل بیت اوس درخت کے پتے ہیں[1]۔

---

[1] نخلِ ماتم مطبوعہ مطبع حیدری ص ۳ :

صحرا کے جا کر ایک گرگ کو پکڑ لائے اور منہ اس کا خون سے بھر کر اپنے باپ کو دکھایا یعقوب نے گرگ کی طرف متوجہ ہو کے فرمایا کہ تو نے میرے نورِ نظر کو کھایا ہے گرگ نے زبان فصیح سے عرض کی .... مجھ سے یہ فعل زبوں ظاہر ہوتا جس وقت مجھ کو یہ طاقت ہو کہ تجھ سے فرزندوں کو تیری ضرر پہنچاؤں کس طرح فرزندِ عزیز کو تیرے کھاتا اور سوا اس کے گوشت نبیوں کا اور ولیوں کا ہم پہ حرام ہے اور آزار پہنچانا اور اذیت دینا ان کو ہمارے مذہب میں گناہ عظیم ہے اور خلاف ہے۔ اے مومنو جس وقت حیوانات دل دکھانا انبیا اور اولیا کا اپنے مذہب میں حرام جانیں اور کیسی وا اسفا جس امت نے کس دلیل سے اور کس طریق سے جرح کرنا فرزند رسول خدا کا حلال اور جائز جانا"[1]

نزول سورۂ یوسف کی وجہ

"ابواب الجنان" کے دیباچہ سے سورۂ یوسف کے نزول کی وجہ بھی سامنے آتی ہے۔ لکھا ہے کہ ایک دن پیغمبر آخر الزماں اپنے نواسوں کو اپنے زانوؤں پر بٹھلا کر پیار فرما رہے تھے کبھی لبوں کا بوسہ لیتے تو کبھی حلقوم کا ناگاہ اللہ کی طرف سے حضرت جبرئیل نازل ہوئے اور دریافت کیا کہ دو میں سے کون زیادہ عزیز ہے۔ جناب محمد مصطفیٰ نے جواب فرمایا کہ دونوں میرے لخت جگر اور نور نظر ہیں۔ حضرت جبرئیل نے کہا کہ خالق قدرت نے فرمایا ہے کہ یہ آپ کے دونوں فرزند شہید ہوں گے۔ یہ سن کر حضرت محمد مصطفیٰ اور دریافت فرمایا کہ کون شہید کرے گا۔ تو حضرت جبرئیل نے جواب دیا کہ وہ لوگ آپ کی امت سے ہوں گے۔ اور آپ سے شفاعت کی امید بھی رکھتے ہوں گے۔ اور یہ کہ انہیں بے قصور قتل کریں گے۔ یہ سن کر رسالتمآب زار زار روئے تھے اور جبرئیل نے تسلی کے لئے یہ مژدہ دیا کہ ان فرزندوں کا خوں بہا روز قیامت شفاعت امت ہو گا۔ اس کے بعد قصۂ یوسف تسکین رسول مقبول کے لئے بیان کیا۔[2]

(ابواب المصائب صفحہ ۹۰ ، باب ۳ فصل ۲)

ابواب الجنان جلد ۲ باب ۸ فصل ۱۲ صفحہ ۱۰

چیزوں کے آنے کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی کیونکہ شعرا کی توجہ نظم ہی کی طرف زیادہ تھی اور اردو میں تمام کا ذکر نظم ہی میں ہوتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر جگہ نظم سے کام لیا گیا ہے۔ اس کے بارے میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ نظم کو دلچسپ تمام کرنے اور سامعین کو متوجہ رکھنے کے لیے شامل کیا گیا ہے کیونکہ اکثر مقامات پر یہ محسوس ہوتا ہے جیسے نثر جو اس میں ملتی ہے نظم ہی کو تشریح کے طور پر تحریر کی گئی ہے۔ یا ایک بات کو نظم اور نثر دونوں میں پیش کیا جا رہا ہے۔ اس کی زبان اس زمانے کے لحاظ سے تو اپنی جگہ اہمیت ضرور رکھتی ہے کیونکہ اردو نثر کی کوئی روایت ہی سامنے نہیں تھی مگر آج کل کی زبان کو سامنے رکھتے ہوئے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ آج کے قاری کو اسے پڑھتے ہوئے خاصی الجھن ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی عبارت اور اس کے واقعات میں ناہمواری پائی جاتی ہے۔ فارسی کے الفاظ اس وقت زمانہ کے مطابق ٹھیک ہیں مگر عربی کی بھی بہت عبارتیں ہیں اور قریب قریب ہر صفحہ پر روایات اور احادیث پر مشتمل پانچ پانچ چھ چھ جملے عربی کے ہیں۔ اس سے مرزا فصیح کے باکمال ہونے میں کوئی فرق نہیں آتا۔ مرثیہ گوئی میں ان کا ایک مقام ہے اور ان کے باکمال ہونے میں کسی کو کلام نہیں۔ ان کی تین مثنویاں ابھی اب تک سامنے آئی ہیں جن کے نام یہ ہیں — "برق الامع"، "مثنوی نان ٹکا" اور "مثنوی چشمہ زمزم"

ذیل میں نمونہ کے طور پر نخل ماتم کا ایک اقتباس نقل کیا جاتا ہے :

"اے شیعیان علی ابن ابی طالب اے محبان اسد اللہ الغالب تمہارا مولا مقبول رب جلیل ہے فخر ابراہیم و اسمٰعیل ہے مثیل جناب رسالت مآب ہے ان کرنے امر محال ہے علی صاحب فضل و مجد و کمال ہے علی کے رتبے نبی جانتے تھے تمام الاولیا کو خاتم الانبیا پہچانتے تھے ۔ روایت ہے ابن عباس سے کہ جناب رسول خدا نے جناب امیر کی شان میں فرمایا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اگر سارے باغوں کے درختوں کے قلم بنا دیں اور دریائے جیحوں کو سیاہی کے بدلے مصرف میں لا دیں اور سب جن جمع ہو کر حساب کریں اور سب بنی آدم کتابت میں شتاب کریں ہرگز نہ لکھ سکیں اس کے فضیلت

میں سے علی مرتضیٰ سے ایک بھی تھا

مندرجہ بالا اقتباس سے چھٹے رطب کی ابتدا ہوتی ہے۔ اس کے شروع میں جناب امیر کی فضیلت کا بیان ہے۔ اس اقتباس سے اندازہ ہوگا کہ مصنف نے قافیہ اور ردیف کا بھی خیال رکھا ہے۔ مثال کے لئے ذیل کے اجزائے کلام ملاحظہ فرمائیں۔

مولا مقبول رب جلیل ہے	فخر ابراہیم و اسمٰعیل ہے۔
- - - - امر محال ہے۔	- - - - کمال ہے۔
- - - - جانتے تھے۔	- - - - پہچانتے تھے۔
- - - - قلم بنا دیں۔	- - - - میں لا دیں۔
- - - - حساب کریں۔	- - - - شتاب کریں۔

اس کے مقابلے میں مرزا دبیر کی تصنیف "ابواب المصائب" اردو کے نثری کارناموں میں زبان و بیان اور ترتیب و تسلسل کے لحاظ سے بہت ہی اہم ہے۔ یہ کارنامہ مرزا دبیر نے اس وقت انجام دیا ہے جب وہ صرف ستائیس برس کے تھے اور طبیعت بہار پر تھی۔ اس وقت کے علمی تقاضے کسی سے پوشیدہ نہیں ہیں اور مرزا دبیر نہ صرف اس میدان کے شہسوار تھے بلکہ ان کا رتبہ نوجوانی میں ہی ایسا تھا کہ پورے میدان پر نگاہ تھی۔ ان کے علم اور ان کے رنگ طبیعت کی قدر ہوتی تھی۔ لوگ سننے کے مشتاق رہتے تھے مگر قدرت نے انہیں ایسی صلاحیتیں ودیعت کی تھیں جن کو ایک فرد واحد سمیٹ نہیں پاتا۔ لیکن مرزا دبیر اپنی صلاحیتوں سے کام لینا جانتے تھے۔ ان کے اظہار کے طریقے ان کو خوب آتے تھے۔ ان کی نگاہ ایسے پہلوؤں پر جاتی تھی جو عام طور پر اوسط درجے کے لوگوں کے سامنے نہیں آتے اور بعد میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ تو سامنے کی چیز تھی اور فن کاری بقول غالب یہی ہے کہ۔

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

: نخل ماتم مطبوعہ مطبع جعفری۔

اسی جذبہ اور اسی صلاحیت نے مرزا دبیر سے الواب المصائب تصنیف کرائی ۔ یہ کتاب مطبع یوسفی دہلی سے شائع ہوئی ہے ۔ سنِ طباعت اس پر درج نہیں ہے[1] ۔ سرورق پر یہ عبارت درج ہے :

فلیضحکوا قلیلاً   ولیبکوا کثیراً

"الحمد اللّٰہ کہ درین ایام حزن التیام رسالہ عجائب و غرائب اعنی ۔

الواب المصائب

من تصنیفات شاعر بےعدیل و نظیر مرجع ہر صغیر و کبیر جناب مرزا دبیر بمطبع یوسفی دہلی طبع شد[2]" ۔

الواب المصائب کا سنِ تصنیف —

کتاب کے آخر میں نو اشعار پر مشتمل ایک قطعہ تاریخ بھی دیا ہے جس کا مصرعہ مادہ تاریخ ہے ع "مصحف طاق چشم اہلِ عزاست" اس سے ۱۲۴۵ھ نکلتے ہیں ۔ قطعۂ تاریخ کے آخری تین شعر یہاں ہدیہ ناظرین کئے جاتے ہیں :-

غور کردم لسیال تالیفش   کہ زآئین فرقۂ شعراست
ناگہاں نوح نوح آمدہ عقل   از چپ و راست داد شرمد است
گفت باھوکہ سال تاریخش   مصحف طاق چشم عزاست[3]

۱۲۴۵ھ

مرزا دبیر کی پیدائش ۱۲۱۸ھ کی ہے اور ۱۲۴۵ھ میں جب یہ کتاب انہوں نے تصنیف کی تو وہ ستائیس[27] برس کے نوجوان تھے ۔

مدت تصنیف —

اس کتاب میں منظوم دعائیہ کے بعد جو خاتمہ مرزا دبیر نے تحریر کیا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ انہوں

---

[1] اس کے صفحات ۱۶۸ ہیں سطر ۱۵ اسطری اور سائز ۸/۲ ، ۵ ہے

[2] : سرورق — الواب المصائب ۔ مطبوعہ مطبع یوسفی دہلی ۔

[3] : الواب المصائب ص ۱۶۸

نے یہ کتاب صرف ایک ہفتہ کے عرصہ میں تصنیف کی اور اس دوران میں وہ مجالس میں شریک ہوتے رہے ہیں یعنی معمول کے کاموں سے جو فرصت ملتی تھی اُسی میں یہ کتاب تیار ہوئی ۔ لکھتے ہیں :

"بحمد للہ لایزالی کہ لشکر حواس اور تردد مقیاس میں بتعجیل تمام اور بعجلت مالا کلام مدت یک ہفتہ میں اس خود غلط نے یہ اوراق سفید سیاہ کئے ہیں ۔ اور اس زمانہ میں بھی اکثر اکتساب ثواب مجلس عزائیں اور تحصیل سعادت ملازمت احبا میں حاضر اور موجود رہا ہے ۔"

اللہ اللہ یہ جوشش طبیعت! اس زمانے میں دوسری مصروفیات کے باوجود ایک ہفتے میں ایسی کتاب تصنیف کرنا دلیل کمال ہے ۔ اس میں شک نہیں کہ ایک آدمی ۱۶۸ صفحات تو کیا ایسی کئی کتابیں ایک ہفتے میں لکھ سکتا ہے ۔ مگر یہ نہ تو کوئی عشقیہ مثنوی ہے اور نہ کوئی ایسی رزمیہ داستان جن میں صرف تخیل سے کام لینا ہی کافی ہو۔ آیات قرآنی اور روایات کے آئینے میں واقعہ حضرت یوسف کو بیان کرنا اور جابجا مصائب اہل بیت کو اس سے ربط دے کر پیش کرنا آسان کام نہیں ۔ اور پھر یہ کتاب نثر میں درجہ اجتہاد رکھتی ہے ۔ زبان اس زمانے کے مذاق عام کے خلاف یعنی سیدھی سادی استعمال کرنا بھی کوئی آسان کام نہ تھا ۔ واقعہ کا انتخاب بھی ایسا کیا جس میں یہ گنجائش تھی کہ مصائب اہل بیت سے ربط پیدا کیا جا سکے اور ان کو تفصیل پیش کیا جا سکے ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مرزا دبیر نے ایک ہیولیٰ ذہن میں تیار کیا اور پھر اسی پر اپنی اس تصنیف کو ڈھال لیا ۔ اس کے تکنیک میں ایک بات کی خاص اہمیت ہے کہ کہیں بھی وہ اصل مقصد سے دور نہیں گئے ہیں ماتم اور عزاداری کے پہلو کو سامنے رکھ کر چلے ہیں ۔

وجہ تصنیف ۔

اس کی وجہ تصنیف کے بارے میں خود تحریر کرتے ہیں :

"باعث تالیف اور سبب تصنیف یہ ہے کہ در ینولا تائید غیبی او بالہام

فارسی بندہ حقیر کثیر التقصیر اشنی دبیر کا یہ عزم بالجزم ہوا کہ ترجمہ سورۂ یوسف کا

مشتمل بمصائب جناب سید الشہدا علیہ التحیۃ والثنا لطریق تازہ اور محض بے

اندازہ از روئے تفاسیر معتبرہ اور احادیث متعددہ کے تعزیہ داران جناب ابا عبداللہ

الحسین علیہ السلام کے مطالعہ کے واسطے زبان اردوئے معلّیٰ میں کرے —"

اس اقتباس سے عیاں ہے کہ جو خدمت وہ نظم میں انجام دے رہے تھے اُس کو نثر میں بھی انجام دینا چاہا تاکہ اس میں بھی اُنہیں مجتہد کی حیثیت حاصل ہو — اور لوگ اس کا نثر کے مطالعہ سے استفادہ کر سکیں

تفصیل ابواب المصائب —

'ابواب المصائب' چھ ابواب پر مشتمل ہے اور ہر باب پانچ فصلوں پر مشتمل ہے۔ تفصیل یہ ہے —

باب اوّل — اس باب میں ابتدائے سورۂ یوسف سے وداع یوسف و یعقوب کے وقت بیان ہوئے ہیں۔ جو حضرت یوسف کے حسن کی تعریف اور صفات امام حسینؑ، حال ولادت حضرت یوسف اور ولادت امام حسینؑ کے حال، برادران یوسف کا حضرت یوسف کے ساتھ سلوک اور اہل کوفہ کا سلوک امام حسینؑ کے ساتھ وغیرہ پر مشتمل ہے —

باب دوم — اس باب میں "دنیا" خواہر حضرت یوسف کے خواب برادران یوسف کی پشیمانی (دنیا) کی بے قراری، اس چاہ کے پرندوں کی کیفیت جس میں حضرت یوسف کو بھائیوں نے پھینکا تھا، حضرت جبرئیل کا اس کنویں میں آنا اور حضرت زینب کی نوحہ وزاری، کوفیوں کی پشیمانی، زائروں کا شہادت حسین کی خبر مدینہ اور دوسرے مقاموں میں پہنچانا۔ خون حسین کے اثر سے یہودی کی بیٹی کا صحت مند ہو جانا اور اس قبیلے کا مسلمان ہو جانا، بیان کیا گیا ہے —

باب سوم — اس میں فرزندانِ یعقوب کا حضرت یعقوب کو یوسف کا خون آلودہ پیراہن

؎ ابواب المصائب (دیباچہ) ص

دکھانا۔ حضرت یوسف کے ساتھ سیاہ رنگ غلام کا بے ادبی کرنا۔ حضرت یعقوب کا نوحہ کرنا حضرت جبرئیل کا حضرت یعقوب کو تسلی دینے کے لئے آنا۔ حضرت یوسف کا قبر مادر سے خطاب ایک شخص کا خواب دیکھنا جس میں وہ خون امام حسین سے حضرت فاطمہ کو پوشاک آلودہ کئے ماتم کرتے دیکھتا ہے۔ جناب زینب امام زین العابدین کا آہ وزاری کرنا۔ اہل بیت پر اشقیا کا ظلم وتشدد اور قتل گاہ میں اہل بیت کا نوحہ ونالے بلند کرنا بیان کیا گیا ہے۔

باب چہارم ـــــ اس باب میں مالک حضرت یوسف کا حضرت یوسف سے معذرت کرنا۔ حضرت یوسف کا قافلہ کے ساتھ مصر میں داخل ہونا اور بعض معجزات حضرت یوسف۔ ساربان کا لاشہ سیدالشہدا کے ساتھ ناروا سلوک، حرم محترم رسول خدا کا کوفہ میں آنا۔ اہل بیت کی شام میں پریشاں حالی کے واقعات بیان کئے گئے ہیں۔

باب پنجم ـــــ اس میں حضرت یعقوب کی دعا حضرت یوسف کی زنداں سے رہائی۔ حضرت یعقوب کا خواب میں حضرت یوسف سے ملاقات کرنا۔ حضرت سکینہ کا حال زار۔ زندان شام میں ان کی وفات۔ حرم اہلبیت کا دربار یزید میں داخل ہونا۔ زوجہ یزید (ہندہ) کا خواب دیکھنا۔ حضرت زین العابدین کو زیارت سر امام حسین کی اجازت نہ ملنا۔ اہل بیت کی مدینہ منورہ کو واپسی اور اربعین کو کربلا میں ان کی عزاداری کا حال بیان کیا گیا ہے۔

باب ششم ـــــ اس باب میں یوسف کی بھائیوں سے ملاقات، یہودا کو حضرت یوسف کا جامہ لے کر یعقوب کے پاس بھیجنا اور عود لیصارت یعقوب۔ حضرت یعقوب سفر مصر اور ان کا شایان شان استقبال۔ اہل بیت کا واپس مدینہ پہنچنا۔ امام زین العابدین کا بشیر کو بلا کر مرثیہ نظم کرنے کے لئے کہنا۔ اہل یثرب کو شہادت حسین کی خبر ملنا اور ان کا ماتم میں مصروف ہو جانا۔ حضرت حمزہؑ کے واقعات شہادت اور ہندہ کی ان کی لاش کے ساتھ بدسلوکی کی بیان کی گئی ہے۔

خصوصیات ابواب المصائب ـــــ

اس تفصیل سے بآسانی اندازہ ہو جاتا ہے۔ کہ مرزا دبیر نے اس تصنیف میں واقعات کو ترتیب دینے میں اپنے علم وفضل سے پورا کام لیا ہے اور واقعات اس طرح سے ایک دوسرے کے مقابل پیش ہوئے ہیں کہ مصنف کا مقصد پورا ہو جاتا ہے۔ کسی تصنیف میں مصنف کی کامیابی یہ مانی جاتی ہے کہ جس مقصد سے وہ کتاب لکھ رہا ہے وہ مقصد پورا ہو اور اس کے پڑھنے والے وہی تاثر لیں [illegible] جو مصنف اس سے چاہتا ہے۔ اس معیار پر اس کو پرکھا جائے تو مرزا دبیر کامیاب نظر آتے ہیں۔

اس تصنیف کی خصوصیات حسب ذیل ہیں۔

زبان — اس کی زبان اتنی آسان اور عام فہم ہے کہ آج بھی جب کہ اس تصنیف کو ڈیڑھ سو سال سے زیادہ عرصہ ہوا، اس سے وہی تاثر لیا جائے گا جو اس کے زمانۂ تصنیف میں اس سے لیا گیا فارسی کے الفاظ اس میں ضرور ہیں مگر وہی جو اردو کے اپنے معلوم ہوتے ہیں۔ اس میں بیان کئے گئے دونوں واقعات تاریخی ہیں اور آیات قرآنی اور احادیث و روایات کی روشنی میں انہیں پیش کرنا تھا اس میں شرعی پابندیوں اور شرعی حدود کی قید بھی تھی مگر اس کے باوجود مرزا دبیر نے واقعات کو ایسے بیان میں پیش کیا ہے کہ معلوم ہوتا ہے کوئی سامنے بیٹھا آنکھوں دیکھی داستان نقل کر رہا ہے۔ جہاں انہوں نے عربی عبارتوں کو نقل کیا ہے۔ وہاں ان کی مختصر تشریح بھی سادہ اور عام فہم زبان میں کی ہے۔ انسان پڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔ اس میں جہاں اشعار کا استعمال کیا گیا ہے وہاں بھی زبان کا خیال رکھا ہے۔ نظم کی زبان بھی بہت ہی آسان اور سادہ ہے۔ مرزا دبیر ایجاد مضامین، خوبصورت تشبیہوں اور عالمانہ خیالات کے لئے بہت مشہور ہیں مگر اس تصنیف میں شامل نظموں سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنا کمال نہیں دکھانا چاہتے بلکہ آسان لفظوں میں صرف اپنا مقصد بیان کرنا چاہتے ہیں۔ اس زمانہ کے مذاق کے خلاف اس میں مسجع مقفیٰ عبارتیں بھی نظر نہیں آتیں۔

تسلسل — زبان کی روانی کی طرح اس میں واقعات کا تسلسل بھی ملتا ہے۔ تدریج قصہ آگے بڑھتا ہے۔ واقعات سامنے آتے جاتے ہیں اور انسان کے تجسس میں اضافہ ہوتا جاتا ہے

ایک فصل سے دوسری فصل اور دوسری فصل سے تیسری فصل کی طرف بڑھتے ہوئے قاری یہ محسوس نہیں کرتا کہ اس نے کچھ کھو دیا ہے۔ یا یہ کہ وہ ایک دنیا سے دوسری دنیا میں چلا گیا ہے۔ کہیں کہیں یہ ضرور محسوس ہوتا ہے کہ واقعات میں زبردستی ربط پیدا کیا جا رہا ہے مگر اس کا سمجھنا مشکل نہیں کہ جو گنجائش واقعہ کربلا میں ہے جتنے پہلو اس واقعہ عظیم کے ہیں، مصائب کی جو داستان اس واقعہ سے منسوب ہے، واقعہ حضرت یوسف اس کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ پھر بھی مصنف نے یہاں واقعات کربلا کو واقعات یوسف کے تحت میں لکھا ہے۔ اگر اس کے برعکس کرتے تو بات بنانا مشکل تھا۔ اسلئے کہ واقعۂ کربلا زندگی کے ہر پہلو کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ دنیا کی کسی بھی مصیبت کسی بھی قربانی اور پریشانی کا میدان کربلا آئینہ ہے۔ یہ انسان کی قربانی کے پرکھنے کی ایک کسوٹی بھی ہے اور وجہ تسلی بھی۔ اگر مرزا دبیر کربلا کے واقعات کو پہلے بیان کرتے تو اس سے یہ تصنیف غیر متوازن ہو جاتی۔ مصائب حضرت یوسف کی توجیہہ اور تشریح مصائب اہل بیت کے مقابلے میں کیا ہو سکتی ہے۔ دوسرا فائدہ اس سے یہ ہوا کہ مرزا دبیر عزاداران حسین کے پڑھنے اور انہیں کی مجلسوں میں پڑھنے کے لئے یہ کتاب تالیف کر رہے تھے۔ اس طرح واقعات حضرت یوسف نے تمہید کا کام کر دیا۔ سب سے بڑا فائدہ اس سے یہ ہوا کہ اس تالیف کا حجم نہیں بڑھنے پایا۔ واقعات حضرت یوسف نے اس کی حدیں خود بخود مقرر کر دیں۔ جو مرثیہ گو تین سو بند کا مرثیہ کہنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ ایک ساتھ دو دو کا تبوں کو دو مختلف مرثیے لکھا سکتا ہو۔ ایک رات میں پورا مرثیہ نظم کر سکتا ہو اس سے نثر میں اتنی مختصر سی تالیف کی امید رکھنا کچھ ممکن ہے۔ اس چیز نے اس تالیف میں تسلسل قائم رکھنے میں بھی مدد دی۔ کمال تو یہ ہے کہ اس میں نہ صرف یہ محسوس ہوتا ہے کہ کوئی واقعہ طویل یا زائد نہیں بلکہ اختصار کے ساتھ ربط واقعات کا یہ عالم ہے کہ آخر تک پڑھنے کے بعد بھی یہ محسوس نہیں ہوتا کہ کوئی چیز چھوڑ دی گئی ہے۔ حقیقی معنوں میں تسلسل اسی کو کہتے ہیں۔

ربط مصائب ——— پوری کتاب میں مصائب کا ربط اس طرح ملتا ہے کہ

انسان کی آنکھوں سے آنسو نکل جاتے ہیں۔ مرزا دبیر کے مراثی بھی بہت بکے ہیں اور وہ تقریباً ہر جگہ کوئی نہ کوئی ٹکڑا یا مصرعہ ایسا لگا دیتے ہیں کہ قاری یا سامع مصائب اہل بیت کی طرف فوراً متوجہ ہو جاتا ہے اور روئے بغیر نہیں رہنے پاتا۔ یہی خصوصیت اس کتاب میں بھی کارفرما ہے۔ قصہ بیان کرتے ہوئے اکثر وہ درمیان میں ایک جملہ ایسا لکھ دیتے ہیں کہ پڑھنے یا سننے والا رو پڑتا ہے۔ اور یہ معلوم نہیں ہوتا کہ یہ کوشش زبردستی کی ہے اور محض مصنوعی یا بے ذہب ہے بلکہ یہ احساس ہوتا ہے کہ شدت جذبات سے مجبور ہو کر وہ آہ بھرتے ہیں یا نالہ سر کرتے ہیں اور ایسے موقعوں میں ان کا قلم بھی لپٹا جاتا ہے۔

تاریخی مواد —— ابواب المصائب میں تاریخی سامان بھی ملتا ہے۔ مرثیہ گویوں کا موضوع اگرچہ تاریخی ہے پھر بھی ان کے بارے میں یہ خیال کیا جاتا ہے کہ انہوں نے تاریخ کو صحیح صورت میں پیش نہیں کیا ہے بلکہ اپنی طرف سے تصرف کر کے تاریخ کی شکل مسخ کر دی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ شاعر کا کام واقعہ میں رنگ بھرنا ہے جیسے کسی خوش مذاق مصور کے سامنے کوئی صورت کھینچنے کے لئے پیش کیا جائے اور وہ اس میں اپنے موقلم سے جان ڈال دے۔ اپنے رنگوں سے اس کو حیات بخشے۔ یہی حال شاعرانہ تاریخ کا ہوتا ہے۔ شاعر واقعہ کا ایک خاکہ لے لیتا ہے اور پھر اس میں جذبات کی رنگ آمیزی کرتا ہے۔ بے شک وہ اس واقعہ کی حدود کے اندر رہنے کی سعی کرتا ہے مگر اپنی زبان نزاکت بیان سے وہ ایسے باریک پہلوؤں کو بھی ابھارتا ہے جو بادی النظر میں سامنے نہیں آتے اور جب سامنے آتے ہیں تو واقعہ کا ہی ایک جز معلوم ہوتے ہیں۔ مرثیہ گویوں کا واقعہ چونکہ مذہبی بھی تھا اس لئے اس میں احتیاط سے کام لینا ضروری تھی کیونکہ مذہب میں تصرف اور تحریف کی گنجائش نہیں ہوتی۔ یوں تو بعض لوگ خلوص سے کام لیتے یا اپنی جہالت کے سبب سے غیر معتبر قصے بھی صادر کرتے ہیں۔ مگر مرثیہ گویوں کا جہاں تک تعلق ہے اول تو ان کے سامنے ذاتی مطلب کی کوئی اہمیت ہی نہیں تھی اور ایسی کوئی بات ہوتی تو وہ ضرور کہتے۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کی زندگی زہد و تقویٰ کی ایک مثال ہوتی تھی۔ سب سے بڑی بات جو ان سے تصرف و تحریف کیا مانع ہوتی وہ ان کا پڑھا لکھا ہونا تھا۔ مرثیہ گویوں کے بارے میں تو [illegible]

میر ضمیر - مرزا دبیر اور میر انیس کے متعلق یہ بغیر کسی مبالغہ کے کہا جاسکتا ہے کہ وہ اعلیٰ پایہ کے عالم تھے۔ اس لئے بھی جہاں اسلامی عقائد، تعلیمات اور واقعات تاریخ سے ٹکراؤ کی کوئی گنجائش پیدا ہو سکتی تھی وہ وہاں بے احتیاطی نہیں برت سکتے تھے - ابواب المصائب میں تو سورۂ یوسف کی تشریح کا معاملہ تھا - یہ کام جہاں مذہبی تھا وہاں تاریخی بھی تھا - پھر روایات و احادیث کی روشنی میں واقعۂ کربلا، شام و مدینہ کی بھی مرزا دبیر جیسے مرثیہ گو کے لئے وہی اہمیت تھی - ان چیزوں کو اس صفائی اور عمدگی کے ساتھ بیان کر کے مرزا دبیر نے نہ صرف ایک تاریخی خدمت کی بلکہ خود تاریخ کی بھی ایک خدمت انجام دی ہے۔

مرزا دبیر عصری تاریخ اور عصری واقعات کا بھرپور شعور رکھتے تھے - مراثی میں وہ اس شعور کا اظہار کر چکے ہیں خاص طور پر اپنے مرثیہ ع اے قہر خدا دبیوں کو زیر و زبر کر - اس کتاب کو تصنیف کرتے وقت بھی انہوں نے ایک تاریخی حقیقت کا انکشاف کیا ہے کہ عزاداری کو زیادہ عروج کب سے ملا اور غرۂ محرم سے اربعین تک اودھ میں عزاداری مستقل طور پر کس عہد سے شروع ہوئی - اس سلسلے میں اس کتاب کے دیباچہ میں تحریر کرتے ہیں :

"ہمارے بادشاہ عصر خلد اللہ ملکہٗ و سلطنتہ کو جناب احدیت نے فخر سلاطین سلف اور رشک بادشاہان عصر پیدا کیا کہ ازل سے آج تک کسی نے بنانے تعزیہ داری تا اربعین نہ رکھی الا اس بادشاہ خلائق پناہ نے یہ رسم حسنات مقرر فرمائی"[1]

اسی دیباچہ میں مرزا دبیر نے عصری تاریخ کا مواد اس طرح بھی فراہم کیا ہے :

"بادشاہ اس عصر کا کہ جمیع خوبیوں سے آراستہ اور تمام نیکیوں سے پیراستہ ہے یعنی کہ آباء و اجداد اس بادشاہ سلیمان جاہ دارا دربان سکندر ایوان یوسف عہد نوشیرواں عصر ابوالنصر قطب الدین بادشاہ غازی نصیر الدین حیدر خلد اللہ ملکہ و سلطنتہ کے بانی

[1] ابواب المصائب - (دیباچہ) ص ۵

خیر و حسنات تھے - چنانچہ نہر آصفی بنائی ہوئی جناب نواب آصف الدولہ مرحوم قریب نجف اشرف کے مثل چشمۂ کوثر جاری ہے - ازیں قبیل ہر ایک کی ذات بابرکات سے بنیاد فیض یادگار آفاق ہے"[1] -

اس طرح سے تاریخی حالات کا بھی اس تصنیف سے اندازہ ہوتا ہے - قدیم تاریخ کی باتیں تو بلحاظ موضوع کتاب اہم ہیں مگر موقع پیدا کر کے عصری تاریخ کے بارے میں کچھ لکھنا ان کی اس صلاحیت کی دلیل ہے کہ عصری تاریخ کا شعور رکھنے کے ساتھ ساتھ اسے محفوظ رکھنے کے بھی مشتاق تھے -

نثر میں موازنہ کی طرح

مرزا دبیر کی اس تصنیف میں موازنہ کی خصوصیات بھی پائی جاتی ہیں - یہ موازنہ اگرچہ واقعاتی ہے مگر اس میں ایک کشش ہے کہ دونوں قسم کے واقعات میں ایک خصوصیت مشترک ہے جو ایک طرف شدت اختیار کرتی ہے اور دوسری طرف اس میں اتنی شدت نہیں - مرزا دبیر نے اگرچہ اس کا اعلان نہیں کیا ہے اور نہ کتاب کے عنوان سے یہ ظاہر ہوتا ہے مگر پوری کتاب میں موازنہ اور میزان کا پہلو واضح ہے - "نخل ماتم" یا "فسانۂ عجائب" میں یہ بات نہیں پائی جاتی - ایک ہی کردار یا شخصیت کی زندگی کے آثار چڑھاؤ کو رقم کرنا یا ایک ہی واقعہ کے مختلف پہلوؤں میں موازنہ کر کے ان کے اسباب و علل کو سامنے رکھنا تو ایک عام چیز ہے مگر دو مختلف واقعات بلکہ دو مختلف داستانوں کی مشترک خصوصیات کو پیش کر کے یہ تاثر دلانا کہ شدت کہاں پہ ہے اور قاری کے ذہن پر اپنے تاثرات نقش کرنا بڑا مشکل کام ہے مرزا دبیر اس میں کامیاب نظر آتے ہیں - اوّل الذکر کی بھی اس میں کمی نہیں اور موخر الذکر خصوصیت پر تو پوری کتاب ہی مبنی ہے - اوّل الذکر کی ایک مثال یہاں پیش کی جاتی ہے :

تب یعقوب علیہ السلام مایوسی جمال یوسف سے بیہوش ہو کر ہوش میں آئے تو فی الفور اپنے بیٹوں کو حکم دیا کہ گرگ کو حاضر کرو - فرزندان یعقوب طرف

[1] ابواب المصائب (دیباچہ) ص ۴

پوری تصنیف میں جو مطالب ہیں ان کا مختصر سا تعارف ذیل میں کرایا جاتا ہے۔

پہلا مطلب — فضیلت سجتن پاک اور حکایت حجاج کہ ایک سید کا قتل چاہتا تھا سید نے اثبات حق کر کے قتل سے نجات پائی۔

دوسرا مطلب — فضیلت امام حسین بہشت سے پوشاک کا آنا حسینؑ کے لئے اور شہادت امام حسینؑ کا بیان۔

تیسرا مطلب — شہادت چہاردہ معصومینؑ کا ذکر اور بیان یہودی کا۔

چوتھا مطلب — فضائل و مصائب حضرت فاطمہ زہراؓ۔

پانچواں مطلب — گریہ و فریاد جناب فاطمہ زہراؓ —

چھٹا مطلب — جناب امیرالمومنینؑ کے فضائل اور اُن کی شہادت کا بیان۔

ساتواں مطلب — معصومین پر بنی امیہ کے ظلم کا بیان۔

آٹھواں مطلب — بیان جوانی عباس مکالمہ امام حسینؑ کا شمر کے ساتھ اور شہادت امام حسینؑ۔

نواں مطلب — فضائل تعزیہ دار اور شیعہ۔

دسواں مطلب — بیان یوم شہادت امام حسینؑ۔ آسمان سے خون برسنا۔ بیان احوال سرہائے

گیارہواں مطلب — بیان فضائل گریہ اور سرہائے شہدا کا شہر عسقلان میں پہنچنے کا۔

بارہواں مطلب — بیان فضائل شیعہ اور ایام محرم اور حضرت سکینہ کے خواب کا بیان۔

تیرہواں مطلب — روایت مومن لمخی کا بیان ۔ معجزات امام ۔ مومن کا پانی میں ڈوبنا اور اس کی زوجہ کا زندہ ہونا)۔

چودہواں مطلب — بیان ثواب گریہ۔

مجلس ماتم ایک ایسی نثری تصنیف ہے جس کی اہمیت صرف اتنی ہے کہ یہ اس زمانے کی ہے جب اردو نثر کی طرف کوئی توجہ نہیں کی جاتی تھی۔ اور موضوع کے لحاظ سے تو خاص طور پر نثر میں ایسی

روضۃ الشہدا میں بھی سورۂ یوسف کے نزول کی وجہ بھی بیان کی گئی ہے ۔ غرض مرزا دبیر کی یہ تصنیف کئی خصوصیات کی حامل ہے اور اس کی رواں نثر کو دیکھ کر یہ بتانے میں کسی قسم کا مبالغہ نہ ہوگا کہ مرزا دبیر کو زبان پر پوری قدرت حاصل تھی اور وہ جہاں جیسی زبان چاہتے استعمال کر سکتے۔ اتنا عرصہ گذر جانے کے باوجود اس تصنیف کی زبان اب بھی بولی اور سمجھی جاتی ہے ۔ اگرچہ مرزا دبیر کے لئے یہ تصنیف کوئی سرمایہ افتخار نہیں ہے ۔ جو مقام ان کا مرثیہ گوئی میں ہے وہ مسلم ہے مگر یہ خصوصیت بہت کم شعراء میں ہوتی ہے کہ ان کی نظم کے ساتھ ساتھ نثر بھی مرزا غالب کی طرح مقبول ہو ۔

قلم کاروں سے گزارش

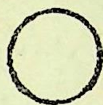
* ــــ مضامین وغیرہ صفحے کے ایک طرف خوش خط لکھ کر روانہ کیا کریں

* ــــ شیرازہ کے لئے روانہ کردہ تخلیقات بغیر اطلاع دیئے کسی دوسرے رسالے کو نہ بھیجیں ۔ تکرار اشاعت پر ادارہ معاوضہ دینے سے معذور ہوگا ۔

* ــــ صرف غیر مطبوعہ اور غیر نشر شدہ تخلیقات ہی بغرض اشاعت روانہ کیا کریں ۔

* ــــ اپنا نام اور پورا پتہ لکھنے کے علاوہ "غیر مطبوعہ" لکھنا نہ بھولیں ۔

اشرف ساحل



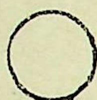
آؤ ٹھہرا ہوا دھواں کھولیں
اپنے گھروں کی کھڑکیاں کھولیں

بند مٹھی میں خواب سوتے ہیں
گرد آلود انگلیاں کھولیں

بیت جائیں نہ رنگ کے موسم
سبز خوابوں کی تتلیاں کھولیں

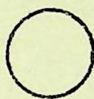
اپنے سائے میں پیڑ سمٹے ہیں
تیز بارش میں ڈالیاں کھولیں

اس طرف پھر ہوا چلے نہ چلے
اپنے جسموں کے بادباں کھولیں



باندھتی ہے روز اک منظر ہوا
نقشِ پا سے موج تک در در ہوا
ڈوب جاتی سمتِ نامعلوم میں
لے کے میرے بام و در سر پر ہوا
میں سلگتی شاخ پر سایہ طلب
چٹکیوں میں لے گئی بھر کر ہوا
آ رہا ہیں مرقدوں کی تختیاں
زینہ زینہ چھوڑتی ڈر کر ہوا
روز خود سے پوچھتا ہوں اک سوال
مانگتی ہے مجھ سے کیوں چیکر ہوا
پھر اسے نادانیوں کا شوق ہے
گھر جلا کر باندھ اپنے سر ہوا
اب صدائے زندہ ہر سو مر گئی
دے سزا کچھ پھینک دے پتھر ہوا
نیم راہ بجھتے چراغوں کا سفر
حادثہ ہے، کہہ گئی آخر ہوا
دھوپ میں جلتے بدن کو آنچ دے
مانگتی شہباز بام و در ہوا

شہباز راجوروی



اب کوئی لفظ نہیں میرے فسانے کیلئے
سارے مفہوم مِٹے خود کو بنانے کیلئے
کس نے آندھی سے لیا مانگ کے چہرہ؛
کون آئیگا ہواؤں کو بُجھانے کیلئے
پھر کسی شاخ پہ باندھے کی ہو الجھ کو
رہ گیا ایک تصوّر ہے دِوانے کیلئے
لوگ راہوں پہ چلے نقشِ قدم کے پیچھے
وہ تو نکلا ہے فقط خاک اڑانے کیلئے



حیدر امامتی

خبیث لمحے

"تمہارا یہ جینے کا ڈھنگ کیسا ہے" میں نے قیصر سے پوچھا۔

"میں دوڑ کر بھاگ جانے کا قائل ہوں"۔ اس نے جواب دیا۔

"تمہارا مطلب زندگی سے مفروریت تو نہیں؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں! وہی"۔ اس نے جواب دیا۔

"لیکن میں اس کا قائل نہیں؟"

اُف! میرے خدا۔ مجھے اب تک سب کچھ یاد ہے۔ میں نے اپنے ذہن کو زور سے جھٹک دیا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے بہت سے ننھے ننھے کیڑے میرے جسم میں رینگ گئے ہوں۔ اب میں تھک چکا ہوں۔ میں نے قیصر کو سمجھایا تھا اسے بتایا تھا کہ غم کے مراحل، جدوجہد کے سخت منازل، راستے کے پیچ و خم میری طرح ہر انسان کو تھکا دیتے ہیں۔ جلا جلا کر صلیب بنا دیتے ہیں۔

اس دن میں تالاب کے کنارے بیٹھا تھا۔ قیصر بھی پاس ہی تھا۔ اس نے تالاب میں ایک کنکر پھینکا۔ پانی کی سطح پر بلبلے اور گرداب پھیلنے لگے۔ پھر

وہ بڑھتے گئے اور آخرکار ختم ہو گئے۔ میں نے قیصر کی طرف دیکھا۔ جیسے پوچھنا چاہتا ہوں کہ یہ ٹیلے اور گرداب کہاں گئے۔ لیکن میں اس سے کچھ نہیں پوچھ سکا۔ صرف اسے ایک ٹک دیکھتا رہا۔ اپنے الفاظ بھی ایک مدت سے اپنی جیبوں اور جسموں کی طرح خالی ہیں۔ کیا یہ سر تا ٹخنے جسم زندگی سے لڑ پائے گا؟ کیا یہ جیت بھی جائے گا؟ لیکن لاکھوں برس سے اس حوا کی بیٹی نے کتنے سڑتے گلتے جسموں کو جنم دیا ہے۔ کیا وہ لوگ صلیب پر نہیں لٹک گئے۔ ان کے جسموں کو چیل کوؤں نے نہیں نوچا۔ میں نے بار ہا کہا۔ قیصرا! میں تم سے جیت نہیں سکتا۔ درخشاں زندگی کا تجسس تمہیں جو رو وحشت پر مجبور کرتا رہا ہے لیکن میں —— میں نئی زندگی کے طلسمی تصورات کی مشعلیں جلاتا رہا ہوں۔

اس روز میں نے ساحل سے پوچھا۔ زندگی کے بارے میں تمہارا کیا نقطۂ نظر ہے۔ ساحل مسکرایا اور بولنے لگا۔ زندگی سورج کا ایک گولا ہے۔ میں ہنس پڑا، لیکن وہ بولتا رہا۔ وہ دیکھو! کس طرح سورج کا گولا شام کو منہ چھپانے جا رہا ہے۔ نہیں! تم نہیں بتا پاؤ گے راحت! —— ٹوٹتا ہی بکھرتا ابھرتا ہے اور یہی زندگی ہے —— میں زیر لب مسکرا رہا ہوں اور سوچ رہا ہوں زندگی کا فلسفہ کتنا کڑوا ہے۔ کس قدر تلخ ہے۔ جیسے! جیسے —— وہسکی یا رم کا ایک گھونٹ۔

میں نے آتش دان میں آگ سلگا دی ہے اور اپنا بوسیدہ رومال نکال کر ٹوٹے ہوئے میز پر رکھ دیا ہے، اور سونا ہی چاہتا ہوں کہ آفتاب طلوع ہو گیا ہے اور اس کی شعاعیں کمرے کے اندر داخل ہو گئی ہیں۔ کھڑکی کے شیشوں پہ باہر برف جم گئی ہے جس سے میں باہر جھانکنے کی ناکام کوشش کر رہا ہوں۔ اچانک میرے کانوں تک یہ آواز پہنچتی ہے۔ کلیم کہہ رہا ہے جب گفت کے دو لوتھڑے آپس میں ملتے ہیں اور ایک دوسرے میں مدغم ہو جاتے ہیں تو

ایک تیسرا گوشت کا لوتھڑا وجود میں آتا ہے اور یہی زندگی ہے۔

مستفیقن کا فلسفہ میں نے قیصر کو سنایا تھا۔ وہ پاگلوں کی طرح ہنسنے
لگا وہ کہنے لگا زندگی پانی کی ایک بوند کی طرح دھوپ میں رکھی ہے اور دھیرے
دھیرے اُڑ رہی ہے تو یہ صلیب کہاں سے آیا۔ عیسیٰؑ کہاں سے آئے میں کہاں
سے آیا۔ تم کہاں سے آئے ——— نہیں راحت! زندگی یہ نہیں ہے۔ زندگی کچھ
بھی نہیں ہے۔ چلو ہم دونوں خودکشی کر لیں۔ اپنے اپنے غموں کا مداوا ڈھونڈ
لیں۔ اپنے اپنے کاندھوں سے یہ صلیب اتار پھینکیں ——— راحت! آخری
سانسوں تک تمہارا دل خلاؤں میں جلتے ہوئے سیاروں کے مانند اس دھرتی پر
روشن رہے گا۔ لیکن تم جانتے ہو کہ تم مر چکے ہو۔ تم اپنی اُنہی ٹانگوں سے ایک قدم
بھی نہیں چل سکتے۔ تمہارا جسم موت سے بھی کڑا ہے۔ تمہاری سُلگتی ہوئی مردہ
آنکھیں جفاکاروں کو بھسم کر دینے کے لئے کافی ہیں۔ تمہارے نفرت سے
تلپتے ہوئے ہونٹ خشک ہیں۔ تمہارے جسم کو کیڑے لگ رہے ہیں ——— راحت۔
راحت! میں بھی تھک گیا ہوں ——— اور میں چونک سا گیا۔ میری آنکھیں اسے
گھورتی رہیں۔ مُندی مُندی آنکھوں سے میں اسے دیکھتا رہا۔ یہاں تک کہ اسکا
وجود دھندلی فضاؤں میں غائب ہو گیا۔ لیکن پھر اُبھر آیا۔ اور مجھے ایسا لگا
جیسے وہ زمین پر بے حس و حرکت پڑا ہے۔ پھر یکایک اس کے جسم سے کُلبلاتے
ہوئے کیڑے نکلنے لگے ——— اور پھر دور دھندلی فضاؤں کو چیرتا ہوا نہ جانے
کہاں سے وہ گدھ اڑتا ہوا آیا اور جھپٹ کر اسے اپنے مضبوط پنجوں میں دبا کر
ایک طرف کو اُڑ گیا ——— فضاؤں میں ہر طرف کیڑے ٹپکتے جا رہے تھے۔



عزیز مجید

صبح ہمارے لئے بھی تو تھی

جب سے عالم ارواح میں اُن نئی بائیس دوشیزاؤں کی روحیں آگئی تھیں تب سے سارے عالم ارواح میں ایک ہو کا عالم طاری تھا۔ نہ نیک ارواح کی حمد خوانی سنائی دے رہی تھی، نہ بری ارواح کی چیخ و پکار۔ ہر روح اپنے اپنے مسکن میں چپ چاپ پڑی کچھ سوچتی رہتی۔ شیطانی ارواح کا حال کچھ زیادہ ہی برا تھا۔ وہ رات دن چپکے چپکے آنسو بہایا کرتی تھیں جب سے عالم ارواح وجود میں آیا تھا تب سے یہ پہلا موقعہ تھا جب شیطانی ارواح بھی اپنی شیطنت کو بھول گئی تھیں جیسے وہ اپنی ہر شیطنت پر شرمسار ہوں۔ عالم ارواح کی اس ویرانی اور افسردگی کو دیکھ کر بزرگ روحیں کانپ رہی تھیں، سب سے بڑی مصیبت یہ تھی کہ عالم ارواح میں وارد ہونے والی یہ بائیس روحیں سب کی سب نیک تھیں، معصوم، پاکیزہ، صاف،

دھلی دھلی سی، جیسے فرشتے ابھی ابھی اُن کے دامنوں پر نماز ادا کر چکے ہوں۔ اس واقعہ سے قبل جب بھی کوئی نئی روح عالم ارواح میں قدم رکھتی تو ایک ہنگامہ سا برپا ہوتا۔ اگر کوئی بد روح داخل ہوتی تو بُری روحیں شادیانے مناتیں، اپنی شیطنت کا کھلے بندوں مظاہرہ کرتیں اور نیک ارواح کا تمسخر اڑاتیں ــــ اور جب کوئی نیک روح عالم ارواح میں وارد ہوتی تو تمام نیک روحیں اپنے رسم و رواج کے مطابق اُس کا استقبال کرتیں اور فوراً ایک دعائیہ مجلس کا اہتمام کیا جاتا۔ لیکن اب کی بار اُن بائیس کی بائیس نیک ارواح نے ایک ساتھ عالم ارواح میں قدم رکھا تھا۔ نیک ارواح کی استقبالیہ کمیٹی پہلے ان بائیس روحوں کو دیکھ کر حیرت زدہ ہوتی پھر خود بخود اُن کی آنکھوں سے آنسو رواں ہوتے اور دوسری طرف بد روحوں کا گروہ جو کیل کانٹے سے لیس ہو کر نیک روحوں کا تمسخر اڑانے آیا تھا ان بائیس ارواح کو دیکھتے ہی سکتے میں آ گیا تھا۔

جب افسردگی کے سمندر میں ویرانی کی وسعت میں مزید اضافہ ہوا تو بزرگ ارواح نے فوری طور پر ایک ہنگامی اجلاس طلب کیا جس میں تمام نیک اور بُری بزرگ روحوں نے شرکت کی۔ اجلاس کی کارروائی کتنی دن تک چلتی رہی ــــ طویل بحث و مباحثہ کے بعد اجلاس اس نتیجہ پر پہنچا کہ تازہ وارد ہونے والی بائیس ارواح سے مکمل تفصیلات جمع کی جائیں کہ وہ دوشیزگی کے عالم میں ہی دنیا کو چھوڑ کر کیوں آئیں۔ وہ کن حالات میں اپنے جسموں سے آزاد ہوئیں، اور جب وہ اپنے جسموں میں تھیں تو اُن پر کیا بیتی ــــ!
مقررہ دن بائیس ارواح کو جلسہ گاہ میں طلب کیا گیا اور اجلاس کے فیصلے سے آگاہ کیا گیا ــــ جسے سن کر وہ پھر سے آنسو بہانے لگیں جیسے اُن کی آنکھوں سے بہتے ہوئے پاکیزہ پانی کے قطروں میں ہر سوال کا جواب پوشیدہ ہو۔

ایک نیک روح جس کے سینے میں ایک بڑا سا سُرخ داغ تھا اور جس نے

صرف ایک لنگوٹی باندھ رکھی تھی نیک ارواح سے مخاطب ہوئی۔

"بیٹیو، ہم تمہیں اس طرح آنسو بہاتے نہیں دیکھ سکتے ۔ جب سے تم یہاں آئی ہو تب سے یہاں کا سارا نظام بگڑ چکا ہے ــــ" اپنی عینک اُتار کر اپنی آنکھیں پونچھتے ہوئے اُس نے اپنا کلام جاری رکھا ۔ "عالم ارواح کے بھی اپنے قوانین اور قاعدے ہیں۔ تمہارے یہاں آنے سے یہاں کے روزمرہ کے کام کاج میں خلل پڑ گیا ہے جیسے تمہیں دیکھکر یہاں کی ہر روح اپنی اپنی جگہ شرمسار ہو ــــ ایسا کیوں ہوا ہے کوئی نہیں جانتا۔ ہماری اس الجھن کو تم ہی دور کر سکتی ہو۔ اجلاس تمہارا مشکور ہوگا اگر تم اپنی اپنی کہانی سے اجلاس کو روشناس کرسکو تاکہ ہمیں غور وفکر کرنے کے لئے مواد مل سکے ۔"

اس نیک روح کے قریب بیٹھی ہوئی ایک اور نیک روح جس کے سینے پر ایک تازہ گلاب مہک رہا تھا نے چشمہ والی روح کی تائید کی۔

تب اُن نیک بائیس ارواں میں سے ایک روح کھڑی ہو گئی اور اپنے چہرے پر پڑی ہوئی نقاب اُلٹ دی۔ اُس کے چہرے پر صبح کا سورج مسکرا رہا تھا۔

"میں ایک دن اپنے بیلوں کی جوڑی کو چارہ ڈال کر فارغ ہوئی تھی۔ میرے بابا کھانا کھا کر کھاٹ پر بیٹھے حُقہ پی رہے تھے، وہ کچھ پریشان سے دکھائی دے رہے تھے۔ میری ماں بھی پریشان نظر آرہی تھی۔ معمول کے مطابق میں اپنے بابا کی گود میں جاکر بیٹھ گئی۔ بابا عادت کے مطابق میرے سر پر ہاتھ پھیرنے لگے۔ پھر میری ماں سے بولے:

"منے کی ماں ۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کریں۔ آج اپنے ہی وطن میں ہم غیر بن کے رہ گئے ہیں ۔ یہاں کی مٹی میں ہماری پانچ پشتیں دفن ہیں اس کے باوجود ہم غیر ملکی ہیں ــــ لیکن ۔۔۔۔ میرے وطن سے میری لاش ہی نکلے گی ۔ !"

بابا نے سچ ہی کہا تھا، اُن کی لاش کو بہت دور تک گھسیٹ کر لے جایا گیا اور پھر اُن کی لاش دریا میں پھینک دی گئی۔ اور مجھے یاد نہیں کہ مجھے مارنے سے پہلے کتنی مرتبہ قتل کیا گیا میں نے اطمینان کی سانس اُس وقت لی جب میں اپنے پنجرے سے باہر نکل آئی ــ!

"میری کہانی بھی کچھ اسی نوعیت کی ہے"۔ دوسری نیک روح جس کے چہرے پر دوپہر کا سورج چمک رہا تھا اپنے آنسو پونچھتے ہوئے بولی "وہ ایک کالی بھیانک رات تھی۔ میرا نوجوان بھائی ایک تیز کلہاڑا لے کر بار بار دروازے کی طرف لپک رہا تھا اور میرا باپ اُسے باہر جانے سے روک رہا تھا۔ ہمارے گاؤں کو چاروں طرف سے گھیرا جا چکا تھا۔ میں اپنی ماں سے لپٹ کر ہچکیاں لے رہی تھی ــ میرا بھائی چیخ رہا تھا چلا رہا تھا ــ "مجھے چھوڑ دو۔ ہم کب تک اس طرح نالی کے گندے کیڑوں کی طرح مسلے جاتیں گے، کیا ہوا کہ ہم اچھوت ہیں، بزدلوں کی طرح مارے جانے سے بہتر ہے کہ ہم اپنے خون سے آگ کے شعلوں کو ٹھنڈا کر دیں ــ"

"میرے بھائی نے بھی ٹھیک ہی کہا تھا۔ اُس کا خون کالی کالی راکھ اور ادھ جلی لکڑیوں میں جذب ہوتا رہا۔ لیکن اتنی ہی دیر میں مجھے نجانے کتنی بار زندہ آگ میں جلایا گیا ــ میں تب تک جلتی رہی جب تک نہ اپنے پنجرے سے باہر نکل آئی ــ"

" ــ وہ خزاں کی ایک خاموش سی شام تھی ــ" تیسری نیک روح جس کے چہرے پر ریگستان کا سورج اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ چمک رہا تھا نے کہنا شروع کیا ــ "میں اپنی تین بکریوں کو لے کر گھر لوٹ رہی تھی۔ پیاس کی وجہ سے میرا بُرا حال ہو رہا تھا۔ میں جلد سے جلد چودھری کاکا کے ٹیوب ویل پر پہنچنا چاہتی تھی۔ چودھری کاکا مجھے اپنے کنویں کا خوب پانی پلاتے تھے۔ آج جب میں کنویں پر پہنچی تو مجھے ایسا لگا

جیسے چودھری کا کا میری راہ دیکھ رہے ہوں۔ انھوں نے مجھے خوب پانی پلایا اور پھر اچانک مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے انھوں نے ٹیوب ویل کا سارا پانی مجھ پر انڈیل دیا ہو۔ میرا دم گھٹنے لگا۔ میں نے چیخنا چاہا لیکن چودھری کا کا بڑا سا ہاتھ میرے منہ پر مضبوطی سے جما ہوا تھا۔ پھر نہ جانے کیا ہوا۔ چودھری کاکا کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ میں نے دھندلاتی ہوئی آنکھوں سے دیکھا۔ چودھری کاکا کا دوست برجو چاچا چودھری کاکا سے کچھ کہہ رہا تھا۔ پھر وہ دونوں زور زور سے ہنسنے لگے۔ ایک مرتبہ پھر مجھ پر ٹیوب ویل کا سارا پانی انڈیل دیا گیا۔ پیاس کے مارے میرے حلق میں کانٹے چبھنے لگے۔ پھر مجھے ایسا لگا جیسے میرے چاروں طرف پانی ہی پانی ہو۔ گرم ابلتا ہوا، مٹیالا، ڈراؤنا اور میں اس میں ڈوب رہی ہوں — میں ہاتھ پاؤں مارنے لگی۔ لیکن میں ڈوبتی چلی گئی — ڈوبتی چلی گئی۔ اور پھر گھبرا کر میں اپنے پنجرے سے باہر نکل آئی —۔"

"میرے بابا، میرے دو بھائی، دوسرے کان مزدوروں کے ساتھ کوئلے کی کان میں اس طرح پھنس کر رہ گئے کہ پھر کبھی نظر نہ آئے —" چوتھی نیک روح جس کا چہرہ یوں نظر آ رہا تھا جیسے سیاہ کوئلوں میں سفید موتی کرنیں بکھیر رہا ہو، اجلاس سے مخاطب ہوئی۔

"اپنے بابا اور بھائیوں کے کان میں پھنس جانے کے بعد میری ماں تھوک کے ساتھ خون اگلنے لگی۔ ایک صبح کو اس نے کھانستے کھانستے دم توڑ دیا۔ میں دن بھر سڑکوں پر بھیک مانگتی پھرتی پھر شام کو مزدوروں کی بستی میں کہیں پڑی سوئی رہتی — ایک رات جب میں اپنے بابا، اپنی ماں اور اپنے بھائیوں کو یاد کر کے رو رہی تھی تو کسی نے میرے سر پر ہاتھ رکھا۔ وہ سُکھ نبین تھا۔ کان کے مالک کا ڈرائیور — وہ مجھے ایک بڑے سے مکان میں لے گیا جہاں مجھے کھانے کے لئے ڈبل روٹی اور پینے کے لئے دودھ ملا۔ پھر مجھے گرم پانی سے نہلایا گیا پھر صاف ستھرے کپڑے پہنائے گئے۔ پھر ایک ایسے کمرے میں لایا گیا جس میں روشنیاں ہی روشنیاں تھیں۔

لیکن جب میں اس کمرے سے باہر نکلی تو میرے چاروں طرف اندھیرا تھا۔ میری حالت دیکھ کر کان مزدور بھپر گئے۔ پولیس آگئی۔ پہلے لاٹھی چلی۔ پھر گولی چلی۔ پھر پولیس والوں نے مزدوروں کو گھسیٹنا شروع کیا۔ مجھے ایک بار پھر کوئلے کی اندھیری کان میں پھینک دیا گیا۔ اب کی بار یہ سارا کام میرے ہی محافظوں نے خود اپنے ہاتھ سے کیا تھا۔ ہزاروں فیٹ نیچے، کہیں پاتال میں مجھے نجانے کب تک گھسیٹا گیا۔ پھر جب میرا سارا جسم لہو لہان ہو گیا اور سانس لینا ناممکن بن گیا تو میں خود اُڑ اپنے پنجرے سے باہر نکل آئی۔!!"

پانچویں نیک روح جس کا چہرہ بادام کے شگوفوں کی طرح کومل تھا پہلے خاموشی سے آنسو بہاتی رہی پھر ایک گہری سانس لے کر بولی۔

"میں ایک سندر سی جھیل میں اپنے ابو کے ساتھ ایک چھوٹے سے ڈونگے میں رہتی تھی۔ میرے ابو کی محبت میرے لئے سب کچھ تھی۔ وہ دن بھر محنت مزدوری کر کے میرے لئے ڈھیر سارے کھلونے لے آتے اور میں شام ہوتے ہی لالٹین جلا کر ڈونگے کے اگلے سرے پر بیٹھ کر اُن کا انتظار کرتی رہتی ــــ اُس دن ابو نے نجانے کیوں آنے میں دیر لگا دی ــــ پھر کسی نے مجھے آواز دی۔ وہ اکبر تھا جو قریب کے ہاؤس بوٹ کے برآمدے میں بیٹھا ہوا تھا۔ وہ ایک چھوٹے سے شکارے میں بیٹھ کر ہمارے ڈونگے تک آیا۔ اس کے بعد کیا ہوا مجھے کچھ بھی یاد نہیں۔ میرے چاروں طرف پانی ہی پانی تھا، لیکن نہیں، آگ ہی آگ تھی ــ شاید لالٹین لڑھک گئی تھی ــ ڈونگہ آگ کی لپیٹ میں آگیا تھا۔ اکبر جا چکا تھا اور ڈونگہ جل رہا تھا۔ میں پانی میں کود کر اپنے آپ کو بچا سکتی تھی لیکن نجانے کیوں میں نے اپنے آپ کو آگ کے شعلوں کے حوالے کر دیا۔ پھر جب جلتا ہوا ڈونگہ آہستہ آہستہ پانی میں بیٹھ گیا تو میں اپنے پنجرے سے باہر نکل آئی۔"

ابھی چھٹی نیک روح اپنی کہانی سنانے ہی جا رہی تھی کہ یکایک جلسہ گاہ میں کھلبلی سی مچ گئی۔ چشمہ والی نیک روح کے سینے کا داغ واضح طور نظر آنے لگا تھا اس میں سے خون کا ایک فوارہ چھوٹ پڑا تھا۔ وہ نیک روح جس کے سینے پر سُرخ گلاب مہک رہا تھا افسردگی کے عالم میں سر جھکائے کچھ سوچ رہی تھی ــ!!

میری نظر میں

(تبصرے کے لئے کتاب کی دو جلد کا آنا ضروری ہے)

○ ——— "اصولِ تعلیم"

خواجہ غلام السیدین

قیمت :- ۲۲/= روپے

ناشر: ترقی اردو بیورو۔ حکومتِ ہند۔ نئی دہلی

خواجہ غلام السیدین کی یہ کتاب ان کی نوجوانی میں شائع ہوئی تھی۔ خواجہ صاحب ایک ماہر تعلیم تھے۔ اگرچہ ان کو ان کے مرتبہ و منصب کی بناء پر اردو میں ساہتیہ اکادمی کا ایوارڈ عطا کیا گیا۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ وہ اپنی ادبی حیثیت سے زیادہ اپنی تعلیمی خدمات کی وجہ سے ہی یاد کئے جاتے رہیں گے۔ خواجہ صاحب کو جن لوگوں نے سنا ہے۔ انہیں ان کی زبان کی مٹھاس اور ان کے لہجے کی نرمی کا خوب اندازہ ہوگا۔ یہ خصوصیات ان کے قلم میں بھی تھیں اور تعلیمات کے خشک موضوع میں بھی

اُنھوں نے بڑی شیرینی اور شگفتگی پیدا کی ہے۔ خواجہ صاحب کے مطالعے کی وسعت نے اِس کتاب کو اس قابل بنا دیا ہے کہ اِسے اساتذہ کے علاوہ عام قاری بھی پڑھے تو لطف اندوز ہوگا۔

کتاب کو اگرچہ ٹائپ میں چھاپا گیا ہے لیکن سچی بات تو یہ ہے کہ بات بنی نہیں۔

کتاب اپنی درسی اور نصابی اہمیت کے لحاظ سے ہاتھوں ہاتھ لئے جانے کی مستحق ہے۔

سوا پانچ سو صفحات کی ضخیم کتاب کے لئے قیمت ناقابلِ یقین حد تک معقول ہے۔



"وضع اصطلاحات"

سید وحید الدین سلیم

قیمت ۱۲/۸۰ روپے

ناشر: ترقی اُردو بیورو۔ حکومتِ ہند، نئی دہلی

"وضع اصطلاحات" اردو کی عہد ساز کتاب ہے اور اس کی وجہ سے صرف وحیدالدین سلیم کا ہی نہیں بلکہ اس کے اولین ناشرِ عثمانیہ یونیورسٹی کا نام بھی روشن ہوا تھا۔ اس کتاب کو دوبارہ چھاپ کر بیورو نے ثواب تو حاصل کیا ہے۔ لیکن اُردو اور اصطلاح سازی کے جدید تقاضوں سے آنکھیں چار کرنے کو ٹال دیا ہے۔ شاید اس کی ایک وجہ اُردو کی کسمپرسی بھی ہو جس کی وجہ سے آج اُردو میں کتابوں کی تواریخی اہمیت کو ان کے علمی اور افادی پہلو پر ترجیح دی جا رہی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ جب سے سلیم نے یہ کتاب لکھی اُردو کا سارا معاشرتی اور سیاسی پسِ منظر بدل گیا ہے اور ان چیزوں کا زندہ زبانوں کی اِصطلاح سازی

سے بڑا گہرا رشتہ ہوتا ہے۔ جو لوگ اس حقیقت سے آنکھ چراتے ہیں وہ زبان کے وسیع مفادات سے وفاداری کا ثبوت نہیں دیتے۔ مثلاً ہندی زبان میں اصطلاح سازی کے جو نئے طریقے اور اصول اختیار کئے گئے ہیں۔ انہوں نے اس زبان کی بنیاد کو وسعت عطا کرنے کے علاوہ اس کی لفظیات کو بھی ایک نئی تندرستی عطا کی ہے۔ ٹی وی کیلئے "دوردرشن" اور جسٹس کیلئے "نیائے مورتی" کی اصطلاحیں وضع کرنا ایک نئے لسانی رویے اور تازہ کاری تخلیقی جہت کا سراغ دیتے ہیں۔ وحید الدین سلیم کے کسی حد تک فرسودہ خیالات کو کسی تازہ کار مرتب کے حواشی کے ساتھ شائع کرایا جاتا تو اس کتاب کی علمی اہمیت میں اضافہ ہو جاتا۔ مگر اس طرح سے تو اردو کے تئیں [illegible] کے مقدس برتاؤ میں شاید فرق پڑنے کا احتمال پیدا ہو سکتا تھا۔ کتاب بیورو کی روایت کے مطابق بہت خوب چھپی ہے اور اس قیمت میں تقریباً مفت ہے۔

○ —— محمد یوسف ٹینگ

